ماھنامہ

ادبِ لطیف

فیض نمبر

فیض احمد فیض

بانی چودھری برکت علی

ماہنامہ

ادبِ لطیف
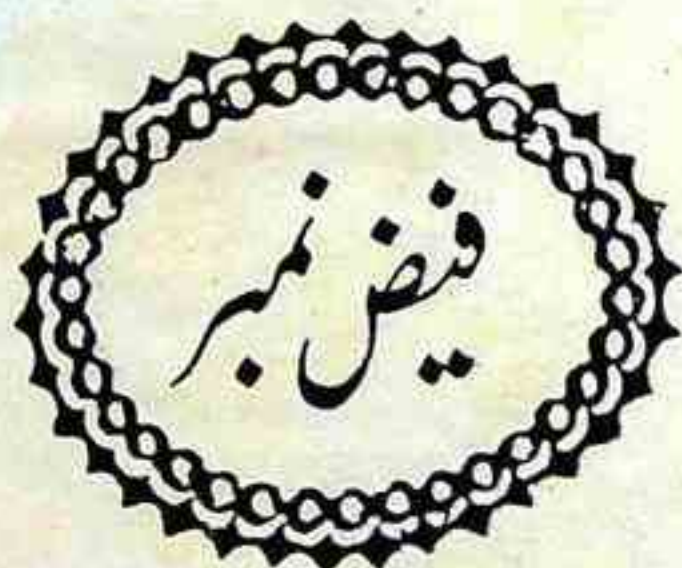
لاہور

ایڈیٹر : صدیقہ بیگم

۲۳ سی - ۳ - گلبرگ ۳ ○ لاہور ۵۴۶۶۲
فون : ۸۷۰۶۲۵ - ۳۷۴۲۲۷۶

ترتیب

آرٹسٹ : ایس ایم منصور

ناشر : افتخار علی چودھری
مطبع : مکتبہ جدید پریس، لاہور

اشاعتِ اوّل : عام ایڈیشن : ۸۵ء
اشاعتِ دوم : لائبریری ایڈیشن : ۸۸ء
قیمت : ۲۵۰ روپے

تقسیم کار : مکتبۂ اُردو
پوسٹ بکس نمبر ۹۵۳۔ لاہور
فون : ۲۷۰۹۸۰

دِن بھر ایک تازہ مہک
اور پُر لطف احساس آپکے ساتھ
گارگلین
ماؤتھ واش
خوش ذائقہ جراثیم کش
خوشگوار سانسوں، دانتوں
مسوڑھوں اور گلے کی حفاظت کیلئے
ناشتے، دوپہر اور رات کے کھانے
کے بعد باقاعدگی سے غرارے کیجئے
120ML

فیض میرے دوست اور جنگ بیروت کے رفیق تھے : یاسر عرفات

وہ ہمارے دلوں میں محبت کے انمٹ نقش چھوڑ گئے ہیں

جب شاعر انقلاب اور " لوٹس " کے ڈپٹی ایڈیٹر انچیف معین بیسو نے پہلے پہل مجھے اُن سے متعارف کروایا تو میرے سامنے ایک مسکراتا چہرہ اور آنکھیں تھیں جو گرمجوشی، اولوالعزمی اور پختہ یقین کے جذبہ سے تمتما رہی تھیں ۔

قبل ازیں معین فیض احمد فیض کو مجاہدین کے ٹھکانوں پر لے گئے تھے ۔ تاہم جب ہم نے بیٹھ کر گفتگو شروع کی اور تفصیل سے تبادلۂ خیال کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے فیض ساری زندگی ہمارے درمیان رہے ہوں اور انہوں نے ہماری تمام صعوبتیں برداشت کی ہوں ۔ اور جدوجہد کے ان طویل سالوں میں ہماری تمام امیدوں میں شریک رہے ہوں ۔

فیض جیسے شخص کے لئے جو اس وقت ۷۰ برس کے ہو رہے تھے یہ فقید المثال بات تھی ـــــ انہوں نے اپنی زندگی کے تمام تکلیف دہ سالوں کے بعد محسوس کیا تھا کہ ان کی جگہ ہمارے درمیان ، فلسطینی مجاہدین آزادی کے درمیان تھی ۔ انہوں نے ہمیں اپنی محبت دی ۔ فلسطین کو اپنی محبت دی ۔ بیروت کو اپنی محبت دی ۔

کیا جس چیز کے لئے انہوں نے عمر بھر جدوجہد کی تھی ۔ انقلاب فلسطین یا بیروت اس کی نمائندگی کرتا تھا ؟

یقیناً ایسا ہی تھا ۔ تبھی تو فیض احمد فیض جیسا اردو کا پہلا اور عظیم شاعر ، بین الاقوامی شہرت کا پاکستانی انقلابی اور عالم اپنے ابدی خواب کی تکمیل کے لئے ہمارے درمیان آ پہنچا تھا ۔

وہ متین و سنجیدہ ہونے کے ساتھ پرجوش اور پرامید شخصیت کے حامل تھے ۔ وہ ان تمام مرحلوں سے ایک لگن اور ولولے کے ساتھ گزرے ـــــ یہ لگن اور جذبہ محض گہرا انقلابی احساس

رکھنے والے شاعر اور انسان کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔

فیض احمد فیض صرف "لوٹس" کے ایڈیٹر انچیف ہی نہیں تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ اور ہمارے درمیان رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس رسالے کا صدر دفتر بیروت میں تھا بلکہ اس لئے کہ اس عظیم انقلابی شاعر کا جذبہ اسے انقلابیوں کے پاس لے جاتا تھا خواہ وہ کہیں ہوتے ـــــ اور اس وقت، اس روز یہ جذبہ انہیں انقلابِ فلسطین کے پاس لے گیا تھا۔

اور محاصرۂ بیروت کے دوران، اس جنگ کے دوران جو اسرائیل نے امریکہ کی مجرمانہ اعانت، اس کی امداد اور اسلحہ کے زور پر شروع کی تھی، اور اس ساری تباہی و بربادی کے دوران فیض احمد فیض نے بیروت چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس زبردست شیطانی اسرائیلی امریکی جارحیت کے خلاف سینہ سپری کے دوران میں اپنے ابدی خواب کی تعبیر دیکھ رہا ہوں۔ یہ تجربہ قوتِ برداشت سے بڑھ کر اور میرے خوابوں سے زیادہ شاندار ہے اس لئے میں اس کے ایک ایک لمحہ سے مسحور ہونا چاہتا ہوں۔ میں اسے کیوں کر چھوڑ کے جا سکتا ہوں؟

فیض احمد فیض میرے دوست تھے اور جنگ بیروت میں میرے رفیق تھے اس دہکتے جہنم میں بھی ان کے چہرے کی لازوال مسکراہٹ ماند نہیں پڑی اور اُن کی آنکھیں ناقابلِ شکست عزم و یقین سے دمکتی رہیں۔

فیض احمد فیض ہمیں چھوڑ گئے لیکن ہمارے دلوں میں محبت کا انمٹ نقش چھوڑ گئے۔ انہوں نے انقلابیوں، دانشوروں اور فنکاروں کی آنے والی نسلوں کے لئے بے نظیر اثاثہ چھوڑا ہے ... اب جب کہ وہ دِل جو حصول آزادی کے بے مثال جذبے کے ساتھ دھڑکتا تھا، دُنیا کے عوام کے مستقبل کی بہبود اور انصاف کے لئے دھڑکتا تھا دھڑکنا بند کر چکا تھا ـــــ فیض کی انقلابی تخلیقات آنے والی نسلوں کی یادداشت میں اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک آزاد و خود مختار فلسطین کے حصول کے لئے ان کا عظیم خواب پُورا نہیں ہوتا ـــــ اور ایک ایسی دُنیا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا جہاں ترقی ہو، بہبود ہو، انصاف ہو اور محبت کا بول بالا ہو۔

یاسر عرفات
چیئرمین مجلس عاملہ تحریکِ آزادیٔ فلسطین
کمانڈر انچیف افواجِ انقلابِ فلسطین

شمیم جہاں

فیض احمد فیض سوانحی خاکہ

نام

فیض احمد خاں ـ مشہور ہوئے فیض احمد فیض کے نام سے

تاریخ ولادت

۱۳ فروری سنہ ۱۹۱۱ء یا سنہ ۱۹۱۲ء

جائے ولادت

قصبہ کالا قادر ضلع سیالکوٹ

ابتدائی تعلیم

سنہ ۱۹۱۵ء میں چار برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا، سنہ ۱۹۱۶ء میں میر سیال کوٹی کے مکتب میں بٹھا دیا گیا جہاں انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی سنہ ۱۹۲۱ء میں لاہور کے ایک مشن ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور پھر عربی میں بی اے آنرز کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے اور سنہ ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز

سنہ ۱۹۳۴ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں [illegible] کے ایم۔ اے۔ او کالج میں فیض احمد فیض کا تقرر بحیثیت لیکچرار ہوا اُس کے بعد سنہ [illegible]

لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں درس و تدریس کے پیشے کو خیرباد کہا اور فوجی خدمات انجام دینے لگے فوج میں کیپٹن کے عہدے پران کا تقرر ہوا اور لاہور سے دہلی آگئے۔ ان کا تعلق فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے تھا۔ ۱۹۴۳ء میں میجر اور ۱۹۴۴ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل کے سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ یہاں انہوں نے ۲۲ جون تک خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد فیض صاحب لندن چلے گئے ۱۹۶۲ء میں وہاں سے کراچی واپس آئے اور عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل و نگراں مقرر ہوئے۔

شادی

فیض احمد فیض نے ۱۹۴۱ء میں ایک انگریزی خاتون مس ایلس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ شیخ عبداللہ (شیرِ کشمیر) نے ان کا نکاح پڑھایا۔ ایلس جارج ادبی دُنیا میں ایلس فیض کے نام سے جانی جاتی ہیں لیکن فیض کی والدہ نے اپنی بہو کا نام کلثوم رکھا تھا۔

بچے

فیض کی اولاد میں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ ۱۹۴۳ء میں اور چھوٹی بیٹی میزنہ ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئی۔

والدہ کا نام

سُلطان فاطمہ

والد کا نام

چودھری سلطان محمد خاں، فیض احمد فیض کے والد سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ علم و ادب سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاءالدین علامہ سید سلیمان ندوی، اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا تھا وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرکردہ رکن تھے۔ ان کی مشہور تصانیف ہیں افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری، جو انگریزی میں ہے۔

بھائی بہن

فیض کی پانچ بہنیں اور چار بھائی تھے دو بھائی اور تین بہنوں کا انتقال فیض کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔

فیض کا زمانۂ قید

فیض احمد فیض، قیام پاکستان کے تقریباً تین سال بعد ہی ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش میں گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ساتھ ہی دوسرے فوجی افسر اور ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیت سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے۔ یہ کیس راولپنڈی سازش مقدمہ کے نام سے مشہور ہوا۔ فیض نے چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔ تقریباً تین مہینے انہیں قید تنہائی کی سزا ہوئی اور اس عرصے میں وہ باہری دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئے۔ تین ماہ انہیں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں گزار نے پڑے۔ یہاں انہیں اپنے دوست احباب بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی حتیٰ کہ وہ اپنا قلم بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ فیض کی بیشتر نظمیں اُن کے زمانۂ قید کی یادگار ہیں۔ "زنداں نامہ" کی بہت سی نظمیں انہوں نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں مارچ ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی لکھی ہوئی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اُن کے یہ اشعار جن میں تلخیٔ حیات اور تلخیٔ کلام کا احساس ہوتا ہے، اِسی زمانے کی یادگار ہیں ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

سازش کیس کے سلسلے میں قید سے فیض ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا ہوئے۔ دوسری بار ۱۹۵۸ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء میں رہائی ملی۔

فیض صحافت کے میدان میں

فیض کی شخصیت صحافت کے میدان میں خوب نکھری اور عروج پر پہنچی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک انہوں نے ماہ نامہ "ادب لطیف" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے،

۵۵ - ۱۹۴۷ء تک اخبار و رسائل میں مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں۔ ان میں چند قابلِ ذکر ہیں ۔

روز نامہ پاکستان ٹائمز

روز نامہ امروز

ہفت روزہ لیل و نہار

اس کے علاوہ فیض صاحب بیروت میں افرو ایشیائی رائٹرز فیڈریشن کے جریدہ ' لوٹس ' کے کافی عرصہ تک مدیرِ اعلیٰ رہے ۔

اعزازات

فیض کو فوجی ملازمت کے دوران ۱۹۴۶ء میں ایم ۔ بی ۔ ای کا خطاب ملا ۔ ۱۹۶۲ء میں فیض احمد فیض کو لینن انعام سے سرفراز کیا گیا ۔ فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے جنہیں یہ عزت بخشی گئی اور جس سے نہ صرف فیض کو بین الاقوامی عزت اور شہرت حاصل ہوئی بلکہ پاکستان ' ایشیا ' اور اردو زبان کا وقار بھی بلند ہوا ۔ اس کے علاوہ نوبل انعام کے لئے بھی ان کا نام دیئے جانے کی تجویز تھی ۔

سیر و سیاحت

فیض نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کئے ۴۸ - ۱۹۴۹ء تک سان فرانسسکو اور جینوا میں رہے جولائی ۱۹۶۲ء سے جنوری ۱۹۶۴ء کے دوران انگلستان ، روس ، الجیریا ، مصر ، لبنان اور ہنگری کے لمبے سفر کئے ۔

۱۹۵۸ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس ، تاشقند میں ہوئی جس میں فیض صاحب نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی ۔

مطالعہ

فیض علم دوست انسان تھے ۔ مطالعہ کا شوق ورثے میں ملا تھا ۔ زمانۂ طالب علمی سے لے کر آخر وقت تک یہ شوق برقرار رہا ، ادب سائنس ، فلسفہ ، نفسیات ، سیاسیات تاریخ اور مذہب ' غرض ہر موضوع پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا ۔ جن اہم شخصیتوں کو انہوں نے پڑھا ' استفادہ کیا اور متاثر ہوئے ان میں چند یہ ہیں ۔

سرسید ' حالی ، گوئٹے ، دانتے ' ملٹن ' ٹالسٹائے ، برنارڈ شا ، سقراط ' افلاطون

ارسطو، ہیگل، مارکس اور نطشے۔

فیض بحیثیت ڈرامانگار

فیض نے ۳۸ - ۱۹۳۹ء میں ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے جو لاہور ریڈیو سے نشر ہوئے اور پسند کئے گئے۔ ان کے کامیاب ڈرامے ہیں۔ 'پرائیویٹ سیکرٹری' سانپ کی چھتری' تماشا میرے آگے' پرائیویٹ سیکرٹری' ادب لطیف ماہ نامے میں شائع ہو چکا ہے۔

فیض کی فلموں سے وابستگی

فیض کا تعلق فلموں سے بھی رہا ہے انہوں نے دو فلموں کے لئے گانے اور مکالمے لکھے۔ ایک فلم ہے "جاگو ہوا سویرا" جو ۱۹۵۹ء میں نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ اس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے، دوسری فلم ہے "دور ہے سکھ کا گاؤں" یہ فلم ابھی زیرِ تکمیل ہے۔

سماجی خدمات

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب فیض صاحب ملازمت کے سلسلے میں امرتسر آئے تو اُن کی ملاقات پطرس بخاری، رشید جہاں، ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر محمود الظفر اور دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے ہوئی۔ اُسی وقت سے وہ سوشلزم کی طرف مائل ہوئے فیض نے اُن لوگوں کے ساتھ مل کر، ریلوے، ڈاک و تار کے مزدوروں کو منظم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد فیض ٹریڈ یونین کے ساتھ وابستہ ہوئے اور ایک عرصے تک ٹریڈ یونین کے صدر رہے۔ سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصہ لیا۔ فیض نے جنیوا اور سان فرانسسکو میں منعقدہ، آئی۔ ایل۔ او کے اجلاس میں شرکت کی۔ یہ فیض کا جذبۂ خدمت ہی تھا جس نے انہیں اپنے ملکی مسائل کے علاوہ فلسطینی مہاجرین اور افریقی عوام کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔

فیض کی تخلیقات۔ شعری مجموعے

۱۔ نقشِ فریادی ۱۹۴۱ء میں پہلا مجموعۂ کلام

۲۔ دستِ صبا ۱۹۵۲ء

۳۔ زنداں نامہ ۱۹۵۶ء

۴۔ دستِ تہِ سنگ ۱۹۶۵ء

۵۔ سروادیٔ سینا ۱۹۷۱ء
۶۔ شامِ شہرِ یاراں ۱۹۷۸ء
۷۔ میرے دل میرے مسافر ۱۹۸۱ء
۸۔ کلامِ فیض ۱۹۸۲ء

نثری مجموعے

۱۔ میزان (تنقیدی مضامین) فروری ۱۹۶۲ء
۲۔ صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط) ۱۹۷۱ء
۳۔ متاعِ لوح و قلم ۱۹۷۳ء
۴۔ ہماری قومی ثقافت ۱۹۷۶ء
۵۔ مہ و سال آشنائی ۱۹۸۰ء
۶۔ سفرنامہ کیوبا ۱۹۷۴ء

دستِ تہہِ سنگ کے علاوہ فیض کے مجموعوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

کلیات

نسخہ ہائے وفا۔ (پاکستانی ایڈیشن)
سارے سخن ہمارے (برطانوی ایڈیشن)

زیرِ ترتیب

۱۔ اردو شاعری کا انتخاب
۲۔ پاکستانی کلچر (اردو اور انگریزی میں)
۳۔ اقبال کی شاعری۔

وفات

فیض احمد فیض دمہ کے مرض میں مبتلا تھے جس نے ان کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ ۱۸ نومبر کی رات کو ہاسپٹل میں داخل کیا گیا۔ ان کو بچانے کی پوری کوشش کی گئی۔ لیکن افسوس ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء بروز منگل، دن میں ایک بج کر پندرہ منٹ میو ہاسپٹل کے ایسٹ میڈیکل وارڈ میں فیض احمد فیض کی شمع حیات گل ہوگئی۔

اب گلاب جیسا ٹیشو لیجئے
روزپیٹل
چہرے کے لیے ایک نرم و نفیس ٹیشو
نیلے ، گلابی اور سفید رنگ میں دستیاب
بڑا سائز
ROSE PETAL
LUXURY SIZE
TISSUES
پیکیجز لمیٹڈ کی ایک نئی پیشکش

BB
tips
سوہنے دیس
لئی
سوہنی چا
بی.بی ٹِپس
Brooke Bond
BB
tips
250g
TEA
خاص تعارفی قیمت
پر دستیاب
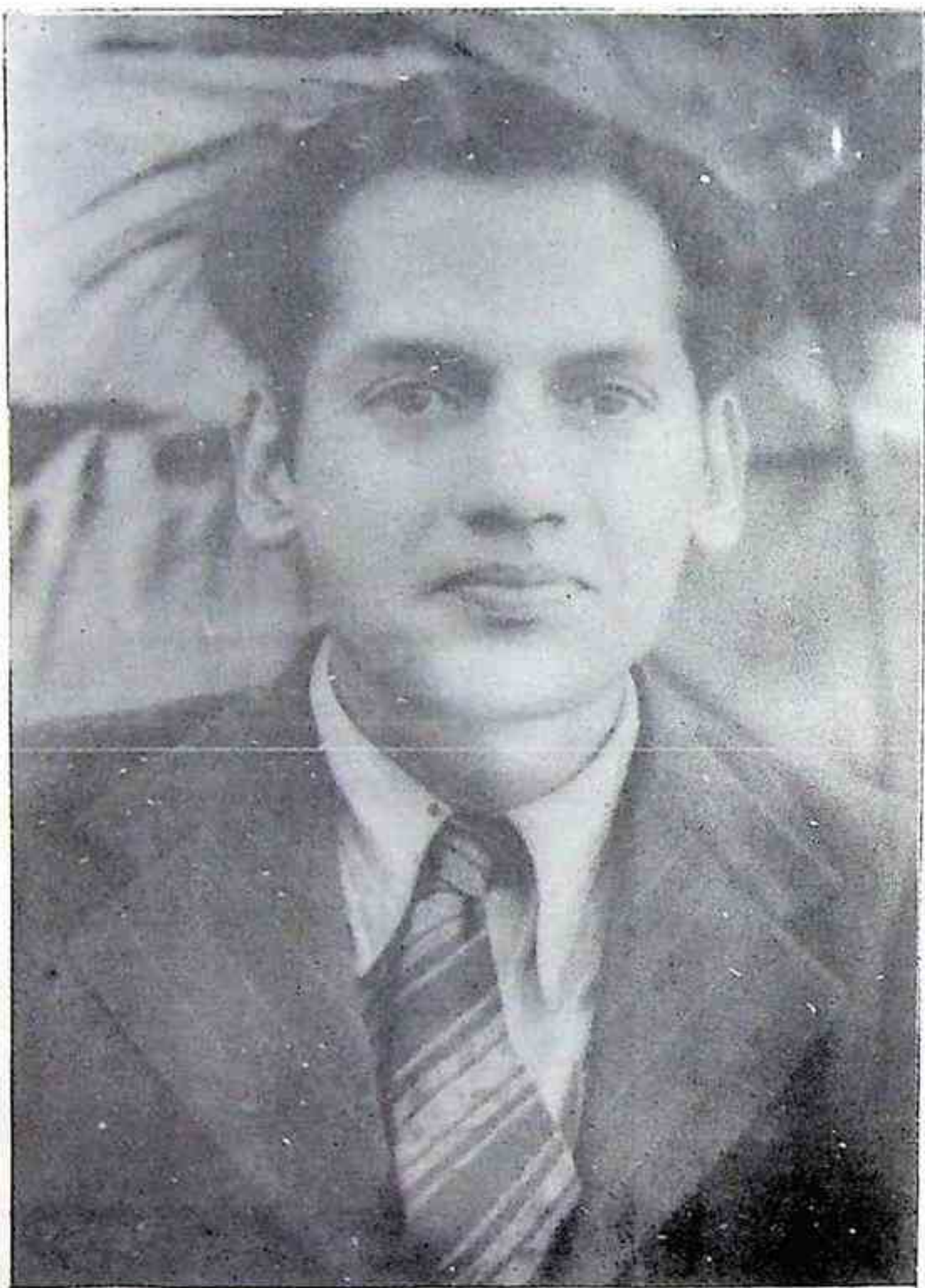
فیض احمد فیض ۱۹۳۵

منیزہ، سلیمہ اور ایلس فیض
کے ساتھ
لاہور دسمبر ۱۹۵۰ء

فیض - ایلس - سلیمہ منیزہ

لاہور ۱۹۷۰
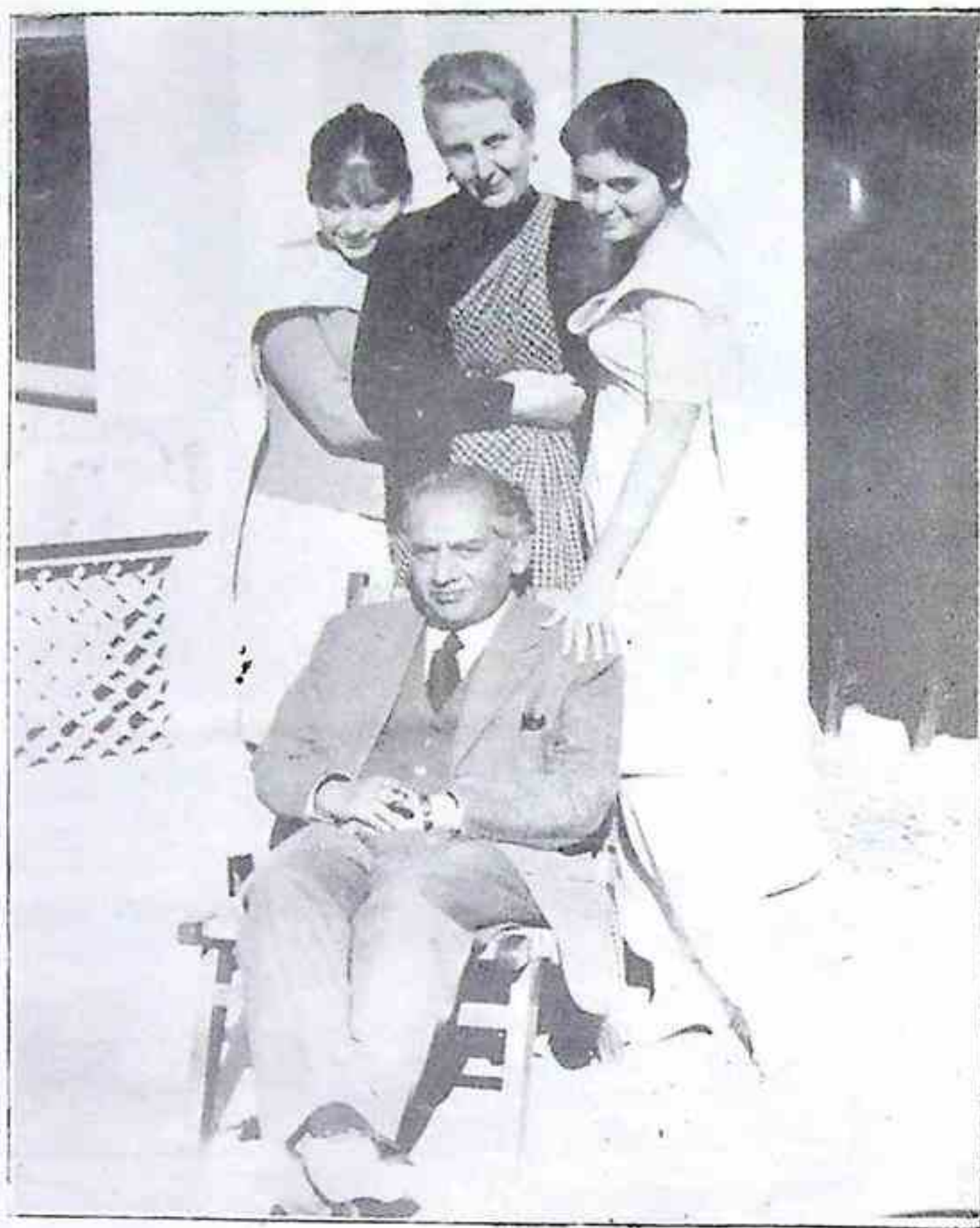
فیض اور ایلس
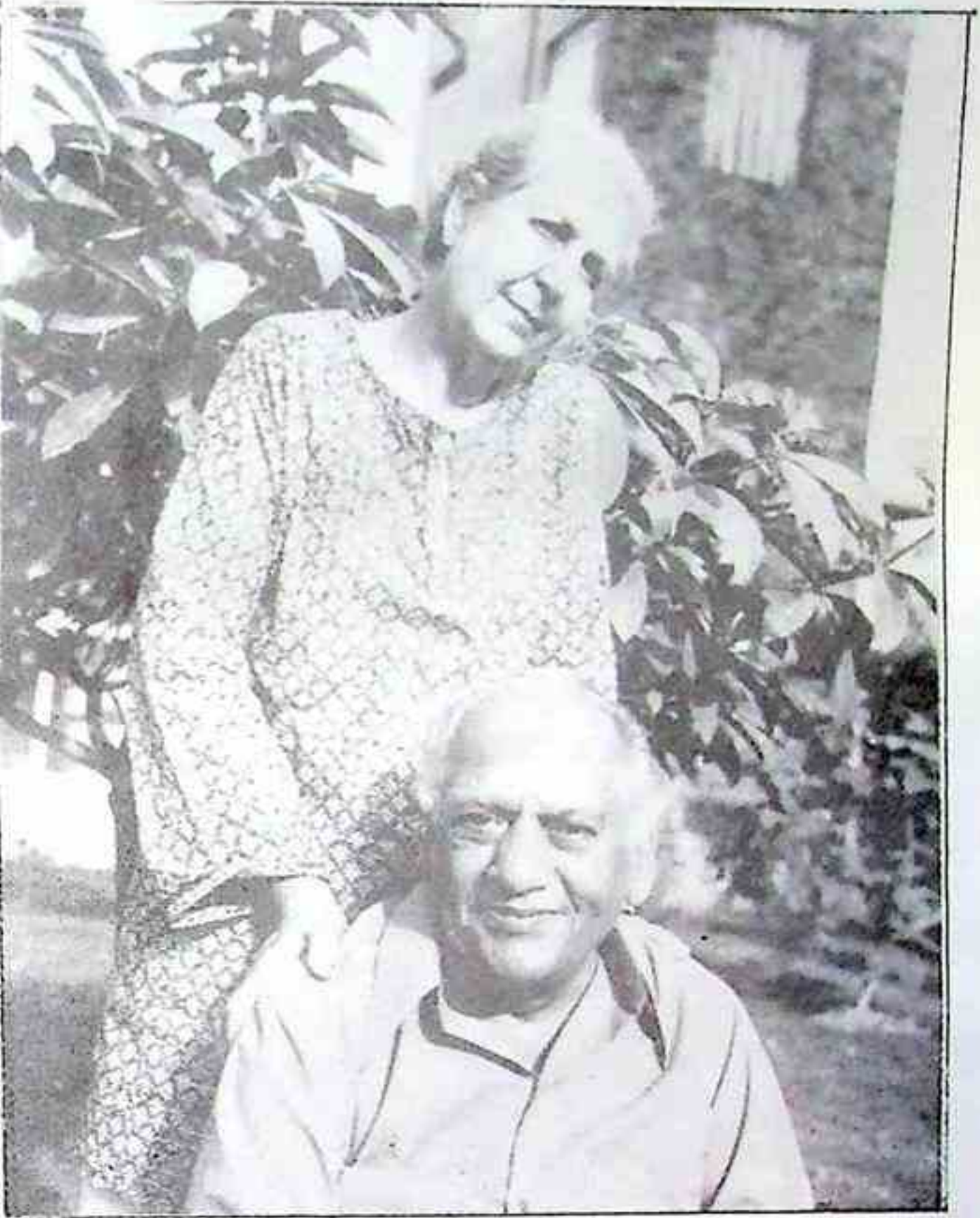
لاہور اپریل ۱۹۷۸ء

جیل سے رہائی کے بعد
پی پی ایل کے
کارکنوں سے
خطاب کرتے
ہوئے۔

۱۹۵۵

فیض بائیں سے
تیسرے اپنے بہنوئی
بھائی اور بھتیجوں کے
ساتھ

فیض اور کرنل مجید ملک
سلیمہ اور شعیب کے
نکاح کی تقریب
۱۹۶۵

١٩٤٩

علی - عدیل - یاسر

میرا - ایلس

اور شعیب

اپریل

۱۹۷۸ء

فیض اور
ڈاکٹر نذیر احمد
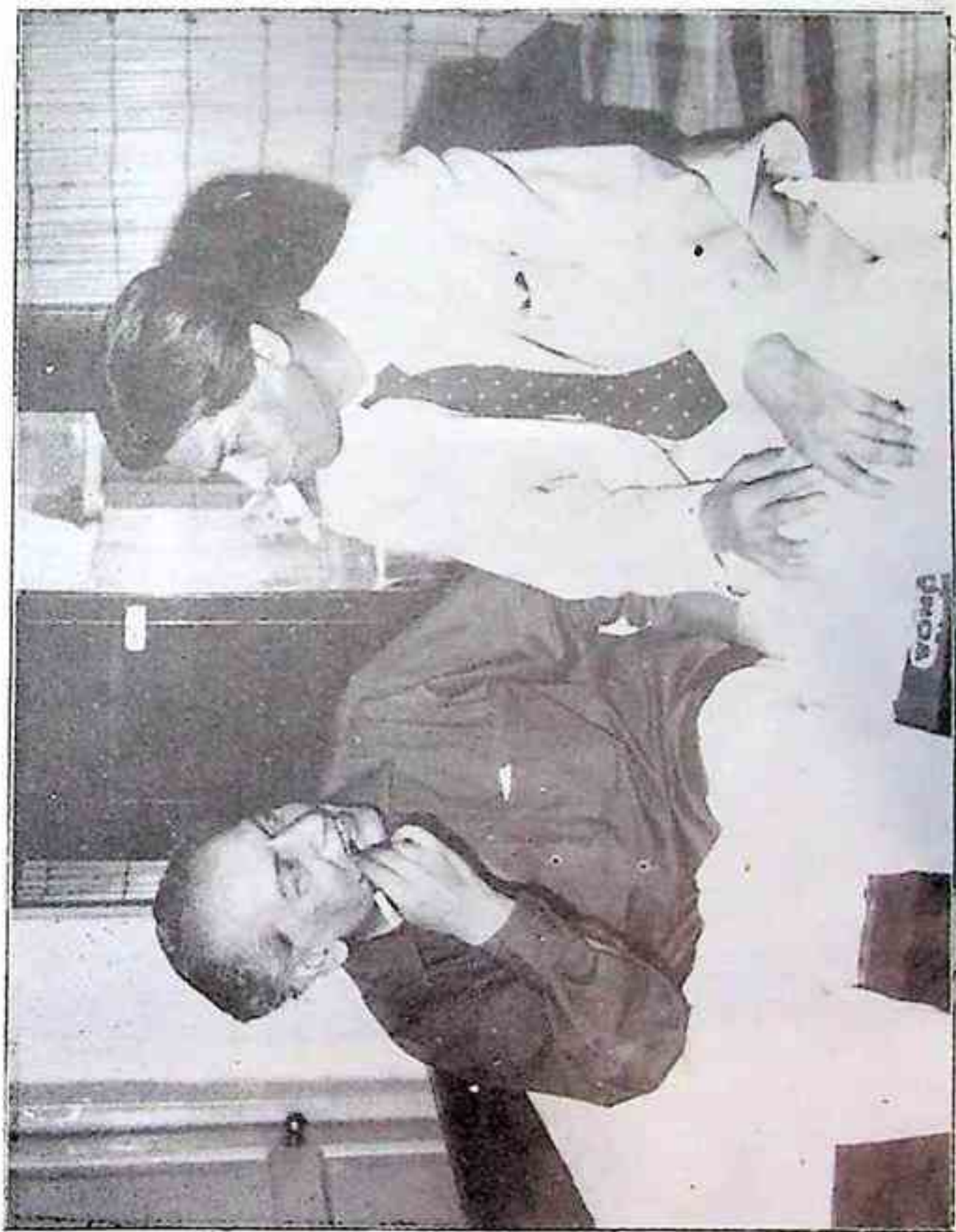
سجاد ظہیر
کے ساتھ

پوسٹ مین
یونین سے
خطاب کرتے
ہوئے

(دائیں سے بائیں، فکر تونسوی، فیض، ڈاکٹر خلیق انجم اور خوشتر گرامی - اپریل ۱۹۷۰ء دہلی

فیض حیدرآباد میں (بائیں سے، مخدوم، ڈاکٹر علیم، فیض، سجاد ظہیر، سلیمان اریب اور پشت کئے ہوئے فراق

سلمیٰ صدیقی۔ کرشن چندر اور فیض

فیض اور قرۃ العین حیدر ماسکو میں

فیض اور سلیمہ

چاٹگانگ ۱۹۵۷
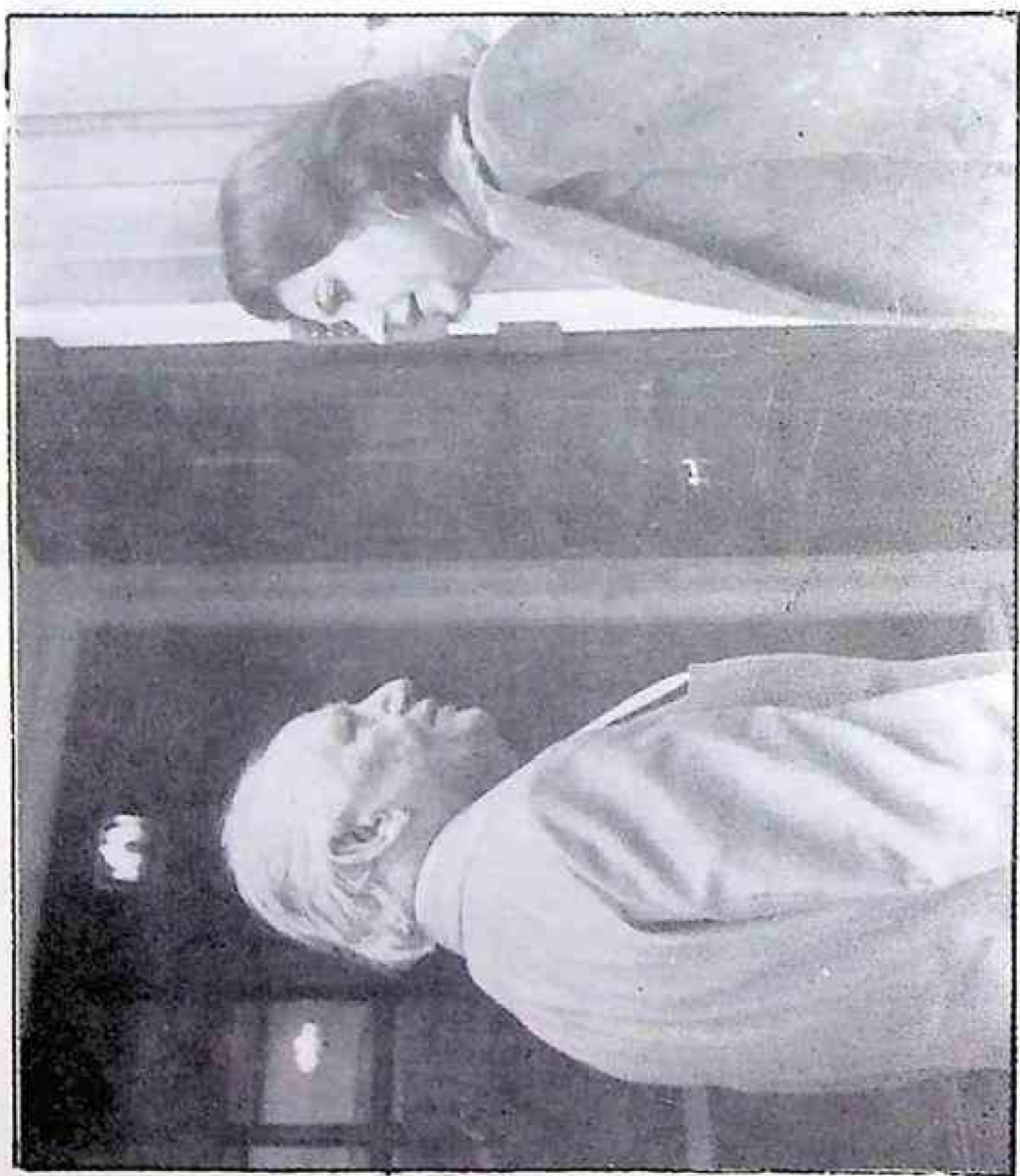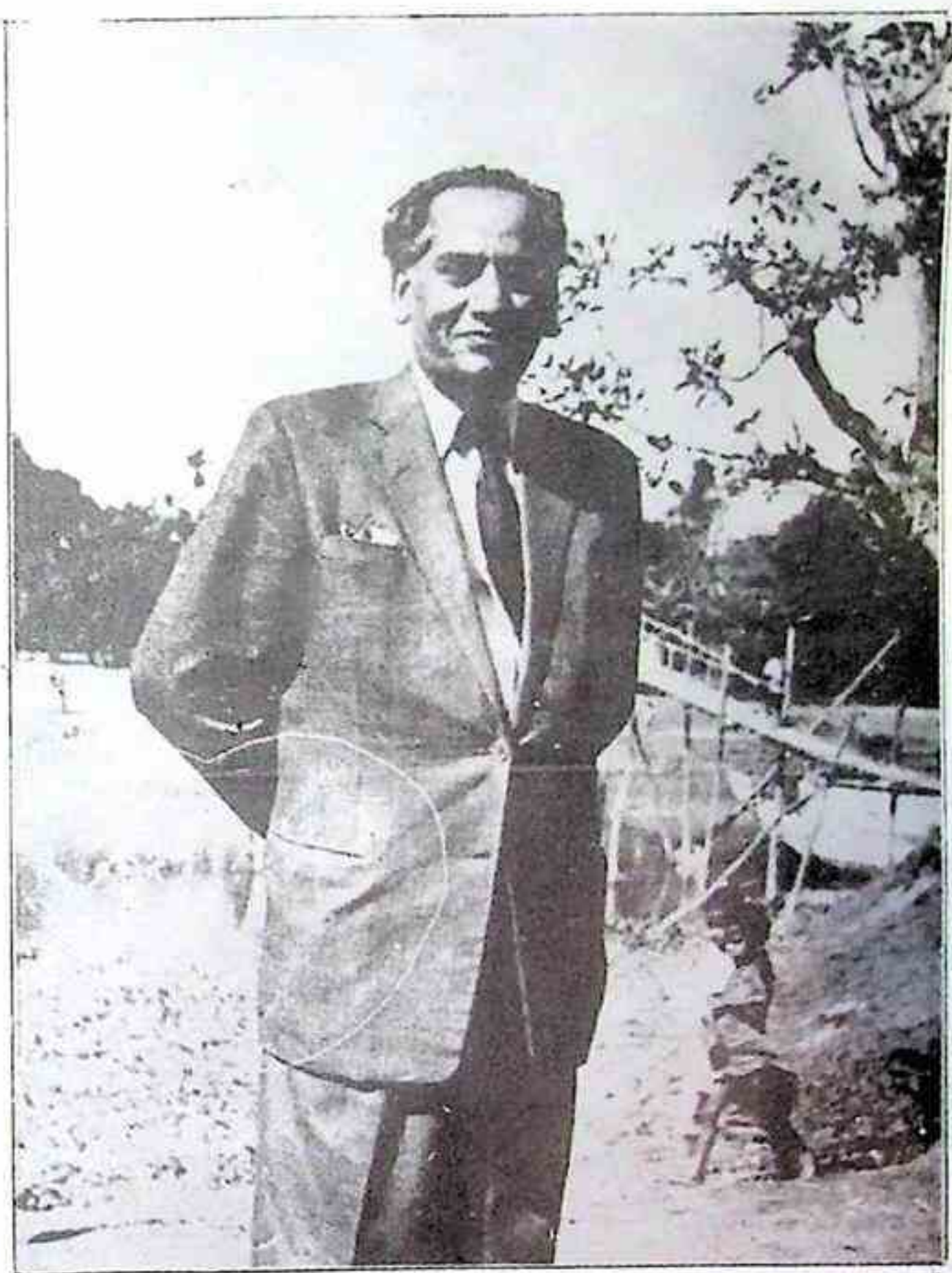
فیض

روسی شاعر رسول حمزہ

کے گاؤں میں

وہاں کے روائتی لباس میں

۱۹۶۷ء

روس میں

(دائیں سے بائیں) ہدایت کار راج کھوسلہ ۔ سنجے دت ۔ نرگس ۔ فیض ۔ بیدی ۔ خواجہ احمد عباس
(پس منظر میں) عزیز قیسی ۔ حسن کمال اور شہر یار کے چہرے دیکھے جا سکتے ہیں۔
سنیل دت و نرگس کے گھر کی ایک یادگار تقریب

(دائیں سے بائیں) ایلس فیض ۔ سنیل دت ۔ فیض ۔ صابر دت اور حسن کمال

لندن

۱۹۷۸ء

پاکستان ٹائمز
کے دفتر میں
احمد ندیم قاسمی،
اقبال سنگھ
اور
ایلس
کے ساتھ
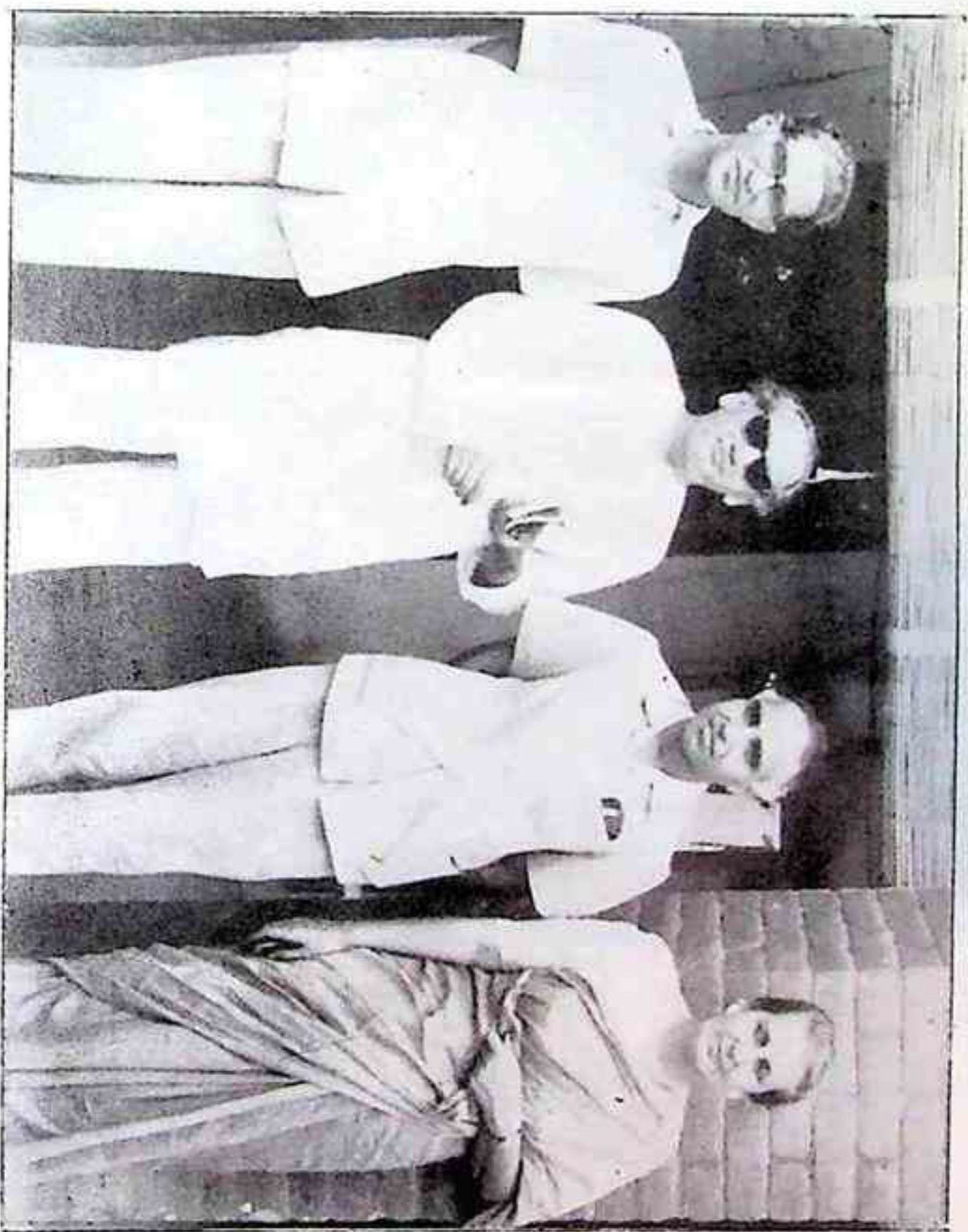
(فیض ایفرو ایشین
رائٹرز کے ساتھ)
دائیں سے بائیں
دید راہی ۔ دیوندر اسیر
فکر تونسوی ۔ قتیل شفائی
اعجاز بٹالوی اور
کشمیری لال ذاکر

بیروت ۱۹۷۹ء
جریدہ "لوٹس" کی
افتتاحی تقریب میں
جناب یاسر عرفات
کے ساتھ انتہائی
بائیں طرف
معین بسیسو
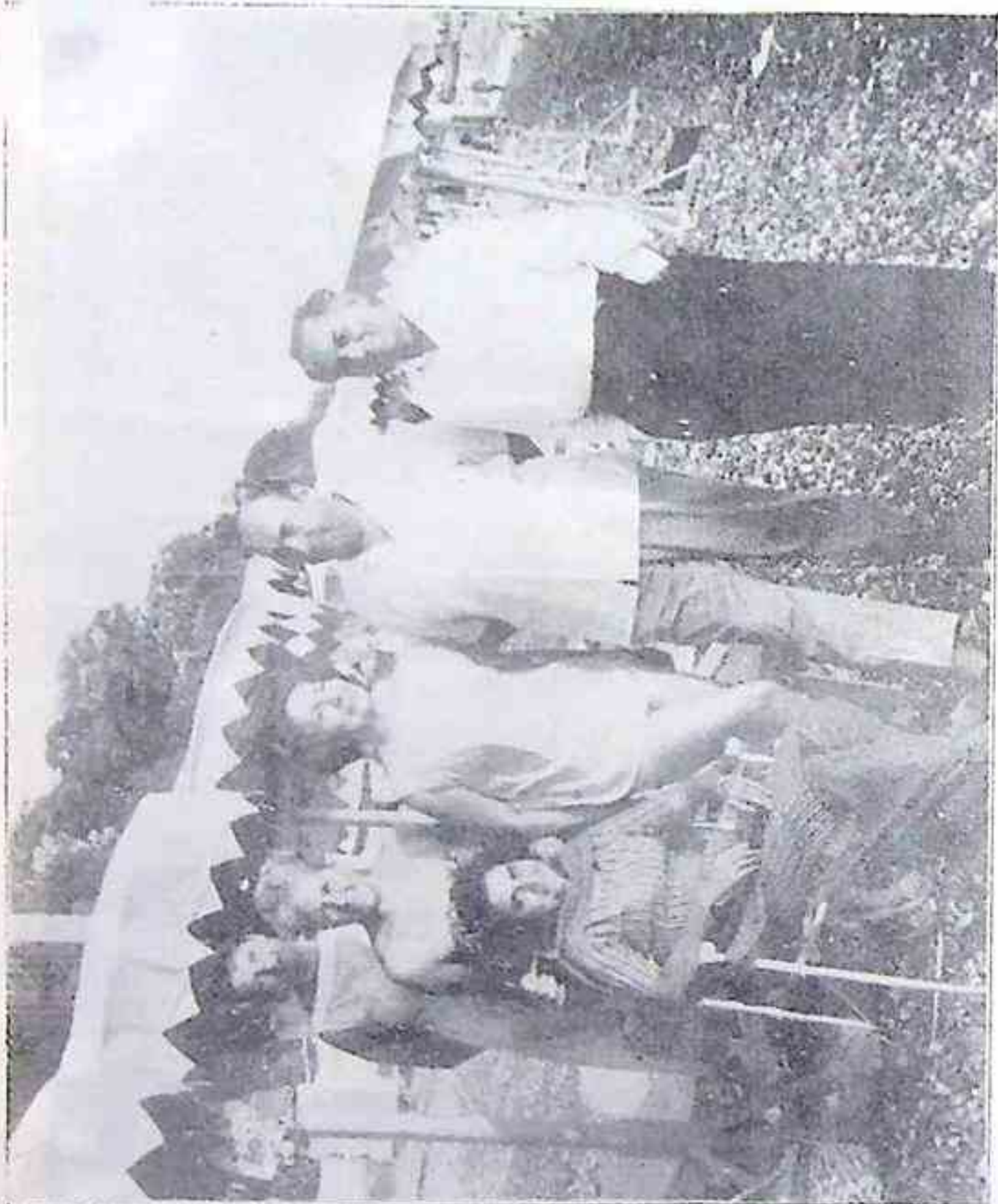
روس میں
پابلو نرودا،
مسز نرودا،
اولگا اور سلیمہ
کے ساتھ
۱۹۶۲ء

تاشقند میں
ایشین رائیٹرز
کانفرنس کے
موقع پر فلسطینی
شاعر معین بسیسو
کے ساتھ
۱۹۸۴ء

روسی ترجمان

سویتلانہ

کے ساتھ

ماسکو میں
اپنی سترھویں
سالگرہ پر

شان الحق حقی
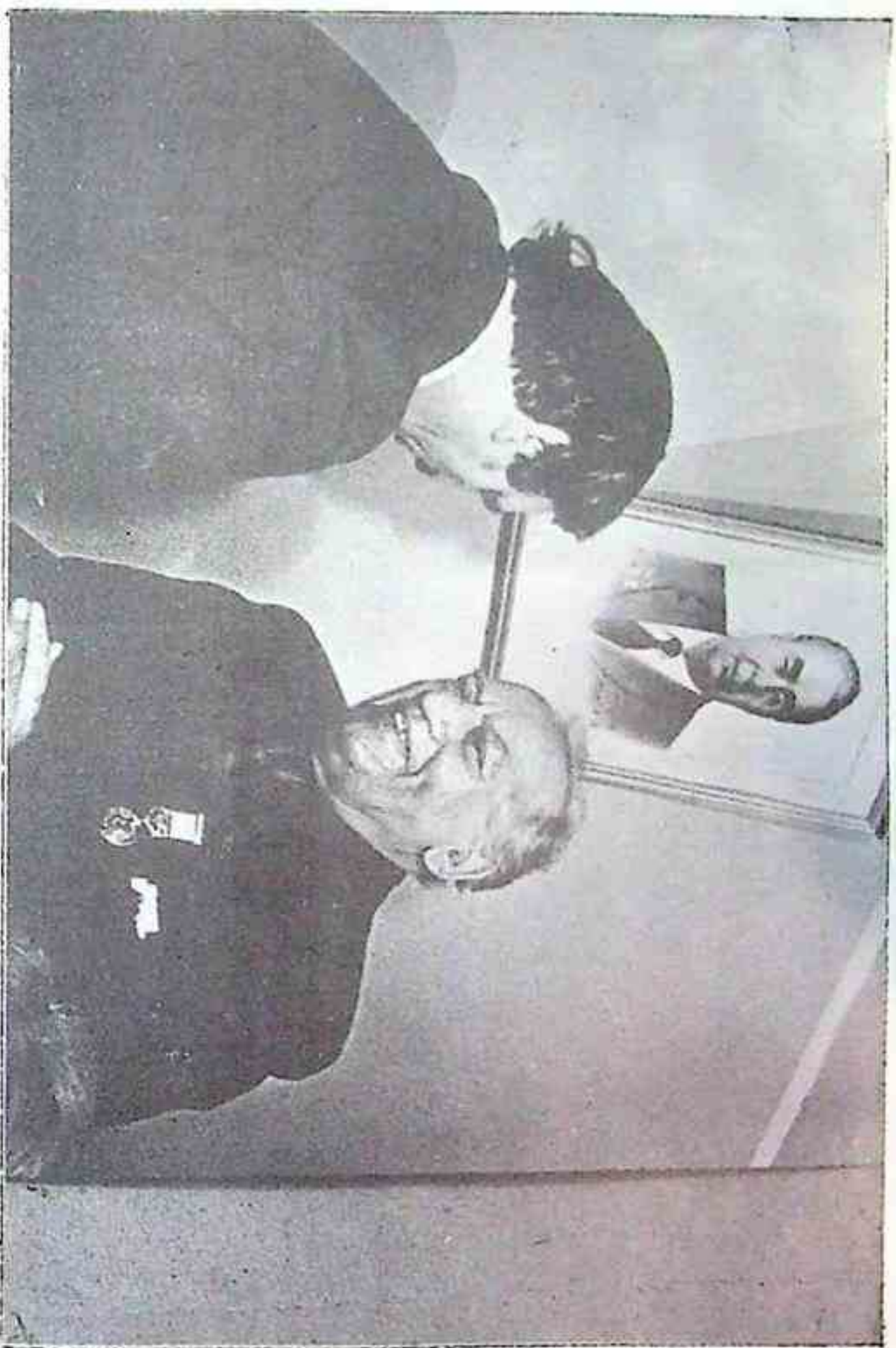
قطعہ تاریخ وفات فیض

مجاہد مخلص رفیق عالی کلام

(۱۴۰۵ھ)

ہو گئی گو عمرِ یک روزہ کی شام
اور چمکے گا ابھی تو اُن کا نام

وہ رفیقِ مخلص عالی کلام
"فیض سب جادو نگاروں کے امام"

(۱۴۰۵ھ)

ادا جعفری

وہ جو فیض تھا

وہ چلا گیا
وہ جو آبروئے چمن بھی تھا
جو نثارِ سرو و سمن بھی تھا
جو غرورِ دار و رسن بھی تھا

کہ قبائے گل میں جو رنگ تھے
وہ اُسی کے داغ جگر سے تھے
جو صبا کے نقشِ قدم سے ملے
وہ اسی کی حدِ نظر سے تھے

وہ جو اس کے لہجے کی نغمگی
وہ جو نغمگی کا طلسم تھا
وہ ثباتِ عشق کی بات تھی
وہ جمالِ درد کا اسم تھا
وہ گواہی شب و روز تھا
کہ دعائے دل میں جو سوز تھا
وہ اسی کے حرفِ سخن سے تھا

وہ امینِ دولتِ غم رہا
وہ امیرِ خاکِ وطن سے تھا
جو وفا کے نام پہ سو طرح
کبھی جی اٹھا کبھی مر مٹا
وہ مسیح و خضر نہ تھا مگر
وہ غزل سرا جو چلا گیا
تو کھلا ہے اہلِ دیار پر
وہ جو فیض تھا الم آشنا
وہ نوا انجمن میں تھا ایک ہی
جسے ڈھونڈتی ہے صدی صدی
جسے موت بھی نہیں چھو سکی

یہ جو دشتِ شب میں چراغ ہیں
اُسی خوش نوا نے جلائے ہیں
اُسی زخم زخم نگاہ نے
مہ و آفتاب لٹائے ہیں
مری آنکھ کو، تری آنکھ کو
جو کرن کرن سے سجا گیا
وہ چلا گیا!

اسرار زیدی

فیض کے نام

آواز کس کو دیں، کوئی سُنتا نہیں یہاں
یارو! سماعتوں پہ تو پہرا نہیں یہاں
بیمار سب ہیں کوئی مسیحا نہیں یہاں

جیسے سکوتِ مرگ کے آثار ہر طرف
اے سحر سامری یدِ بیضا نہیں یہاں
اے کوہِ طور اب وہ تماشا نہیں یہاں

آنا تھا جن کو وہ تو سرِ دار آ چکے
جاں دادۂ ستم کوئی ایسا نہیں یہاں
سَر میں جنُونِ عشق کا سودا نہیں یہاں

دریا پہ العطش کی صدائیں بلند ہیں
کس نے کہا کہ کوئی بھی پیاسا نہیں یہاں
کس نے کہا کہ آج بھی پہرا نہیں یہاں

محسن احسان

بیادِ فیض

مٹّی میں جس کو سب نے اتارا نظر میں ہے
شہرِ سخن کا راج دلارا نظر میں ہے

جن بستیوں میں اس نے لٹائی جنوں کی فصل
ان بستیوں کا سارا نظارا نظر میں ہے

کس طرح گھل گیا ہے شفق میں کرن کا نور
کیسے بجھا ہے صبح کا تارا نظر میں ہے

جس نے بساطِ حرف و سخن کو پلٹ دیا
بازی جو جیت جیت کے ہارا نظر میں ہے

جس نے جلائیں لفظ و معانی کی مشعلیں
شعر و سخن کو جس نے سنوارا نظر میں ہے

جاتا ہے کون کون سرِ کوئے دلبراں
کرتا ہے کون کون کنارا نظر میں ہے

فیض صاحب سے ایک بات چیت

فیض احمد فیض سے یہ بات چیت ۲۰ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ان کے مکان پر ہوئی۔
اس بات چیت میں سہیل احمد، جاوید شاہین، مسعود اشعر اور محترمہ منو حفیظ
نے حصہ لیا۔

سہیل احمد: فیض صاحب، آپ کے انٹرویو تو بہت ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے بارے میں جو سوال پوچھے جاتے ہیں ہمارے پڑھنے والے ان سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ ان سوالوں سے ہٹ کر ہم آپ سے براہ راست اس زمانے کے ادبی ماحول کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں جس زمانے میں آپ نے شعر کہنا شروع کیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک زمانہ گزر جاتا ہے۔ تو اس کے بعد آنے والی نئی نسل کے سامنے اس ادبی ماحول کا پورا نقشہ نہیں رہتا۔ آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت شاعری میں دو بڑی شخصیتیں تھیں۔ ایک اختر شیرانی اور دوسرے حسرت موہانی۔ اقبال کا ذکر ہم اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ایک عظیم الشان آواز اور ایک منفرد لہجے کے ساتھ بالکل الگ تھے۔ اس حوالے سے آپ اس زمانے کے ادبی ماحول کے بارے میں کچھ بتلائیے۔

فیض: بات یہ ہے کہ اختر شیرانی کو تو ایک طریقے سے مولانا حسرت موہانی کا گر سمجھنا چاہیے۔ دراصل ۲۰ء اور ۳۰ء کا جو ابتدائی زمانہ تھا۔ اس میں ہمارے ہاں رومانیت کی لہر چلی تھی اور بھی کئی طرح کی لہریں تھیں۔ ایک تو ٹیگور کی گیتانجلی کا قصہ تھا۔ اس سے

طرح طرح کی چیزیں نکلیں دوسرے اسی زمانے میں یورپ میں بھی AES THETIC
اور ادب برائے ادب کی تحریک چلی تھی اُس کی کچھ سماجی اقتصادی اور سیاسی وجوہات
بھی تھیں۔ پہلی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد یورپ اور ہمارے ہاں بھی مالی حالات
پہلے سے بہت بہتر ہو گئے تھے۔ یعنی تھوڑا سا فارغ البالی کا دور دورہ تھا اسی وجہ سے ادب
برائے ادب اور جمالیات اور رومانویت کا چرچا زیادہ ہو گیا تھا چنانچہ غزل میں سب سے
پہلے اس کا اثر حسرت موہانی نے قبول کیا اور رومانوی شاعری شروع کی ہمارے ہاں اختر شیرانی
اس کے نمائندہ شاعر تھے۔ غزل کے جو دو پرانے سکول تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے ان میں سے
دہلی سکول میں کچھ ابہام تھا اور کچھ ماورائیت تھی۔ لکھنؤ سکول اگرچہ ایک طریقے سے زندگی
سے قریب تھا لیکن اس میں طوائفیت نمایاں تھی لیکن حسرت موہانی نے رومانوی شاعری کو
زندگی سے قریب تر کیا۔ حسرت موہانی جیسے فاسقانہ شاعری کہتے تھے۔ وہ نہ تو بازاری شاعری تھی
اور نہ ماورائی شاعری لیے اگر ہم ذرا سے پہلے جائیں تو ہمیں اس کی ابتدا مثنوی زہر عشق سے کرنی چاہیئے۔
وہ پہلی مثنوی ہے جس میں حقیقت پسندانہ طور پر جذباتی معاملات اور جذباتی کاروبار تفصیل کے
ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مولانا حسرت موہانی نے دہلی اور لکھنؤ کے لہجوں سے ہٹ
کر غزل میں سچے جذبات کا اظہار کیا اور جس طریقے سے لوگ عاشقی کرتے تھے۔ (شریف لوگ۔
بازاری لوگ نہیں) اس کا بیان کیا۔ ٹھیک ہے اس زمانے میں قیود بھی تھیں مختلف قسم
کی لیکن ان کے اندر ہی تھوڑی بہت گنجائش بھی تھی۔

جاوید شاہین : فیض صاحب، آپ نے حسرت موہانی اور اختر شیرانی کے زمانے
میں شاعری شروع کی لیکن آپ کی شاعری ان دونوں سے مختلف نہج پر شروع ہوئی اس میں
غم جاناں اور غم دوراں دونوں کا امتزاج ہے آپ کا لہجہ بالکل نیا تھا جو اردو شاعری میں پہلے
نہیں ملتا۔ آپ نے اپنی شاعری کے لیے جو موضوع چنا وہ بھی بالکل نیا تھا۔ یہ اثر آپ کے ہاں
کہاں سے آیا؟

فیض : ہم نے ۲۸ء اور ۲۹ء میں جب شاعری شروع کی ہم اس وقت کالج
میں تھے۔ سیالکوٹ میں اس وقت ہمارے سامنے اختر شیرانی تھے۔ اور اختر شیرانی سے
زیادہ تھے ن م راشد۔ وہ ہمارے ساتھ تھے ہم سے ایک سال آگے تھے۔ تو جو سلسلہ حسرت
موہانی سے شروع ہوتا ہے وہ اختر شیرانی اور ن۔ م راشد سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔

چنانچہ ہم نے جو ابتدائی دو انہیں کے زیر اثر کی لیکن ہماری کوشش یہ رہی کہ کہیں ان کی نقل نظر نہ آئے۔ اس وقت کا ہمارا بہت سا کلام ہے جو ہم نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ بہرحال ہماری ابتدا اسی اثر کے تحت ہوئی۔ بعد میں دو تین باتیں ہوئیں۔ ایک تو ذاتی سی بات ہے اور وہ یہ حادثہ ہے کہ ہمارے ابا فوت ہو گئے اور ہم اچانک ایک رئیس زادے سے فاقہ مست ہو گئے۔ اس وقت پتہ چلا کہ محض عاشقی سے کام نہیں چلتا زمانے میں اور بھی دکھ ہیں اس کے بعد یہ ہوا کہ ہم نے پڑھائی ختم کی اور ملازمت کی تلاش شروع کی۔ گھر والوں کا اصرار تھا کہ مقابلہ کا امتحان دیں اور آئی سی ایس افسر بنیں۔ ہم نے امتحان دیا بھی۔ لیکن ہمارا ارادہ تھا نہیں اس قسم کی نوکری کرنے کا۔ چنانچہ ہم نے ایک پرچہ ہی نہیں دیا۔ اس طرح اتفاق سے ہماری جان بچ گئی۔ ایک تو ذاتی حالات ایسے تھے۔ دوسرے ساری دنیا اس وقت اقتصادی بحران اور کساد بازاری کا شکار ہو رہی تھی (یہ ۱۹۳۰ کا زمانہ تھا) خیر ہمیں ملازمت ملی اور ہم پڑھانے کے لیے امرتسر پہنچے تو وہاں ملاقات ہوئی صاحبزادہ محمود الظفر سے وہ نئے نئے انگلستان سے وارد ہوئے تھے۔ جہاں تازہ تازہ انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر تاثیر، ملک راج آنند سجاد ظہیر:۔۔۔

جاوید شاہین:۔ احمد علی۔۔۔۔۔

فیض:۔ نہیں وہ بعد میں شامل ہوئے تھے۔ تو یہ لوگ شامل تھے ان کے ایک نمائندہ محمود الظفر تھے۔ ہمارا وہ عاشقی کا زمانہ تھا۔ ہمیں اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ دردِ دل سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔ پھر صاحبزادہ محمود الظفر کی بیگم پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں۔ انہوں نے نسخہ بتایا کہ تم کس چکر میں پڑے ہو۔ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ انہوں نے بتایا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے ادیبوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ خیالی باتیں کرنے کے بجائے حالات کو سمجھیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور اس کی ترجمانی کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہ سب ہم نے ان سے سیکھا۔ پھر ایک سال بعد کانفرنس ہوئی اور تنظیم قائم ہو گئی۔

سہیل:۔ یہ باتیں سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھی ہیں۔ اچھا فیض صاحب یہ بتائیے کہ آپ کے اکثر نقاد کہتے ہیں کہ فیض نے ہماری پرانی روایتی غزل کی علامات بلکہ ان میں نئے معانی شامل کر لیے ہیں آپ اس زمانے میں نظم کی طرف مائل تھے لیکن ساری امیجری اور

تلازمات غزل کی دنیا سے لے رہے تھے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

فیض: بات یہ ہے کہ اختر شیرانی، حسرت موہانی اور ان کے ہم عصروں کے اثر سے آزاد ہو کر ہم نے نظم کی طرف توجہ کی۔ لیکن غزل کی بحریں استعمال کر کے ہم سمجھتے تھے کہ اس طرح آسانی سے بات کی جا سکے گی۔ ہم نے دریافت کیا کہ غزل کے جو امکانات ہیں ان سے سوائے اقبال کے جو ہمارے سامنے اس وقت بھی چھت پر بیٹھے تھے، لوگوں نے صحیح استفادہ نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ہم نے اس وقت فارسی بھی پڑھی۔ کالج میں ہمارے پاس فارسی نہیں تھی عربی تھی۔ ہم نے کالج میں فارسی اس لیے نہیں پڑھی کہ وہ تو گھر کی زبان تھی ہمارے گھر میں بولی جاتی تھی۔ لاہور پہنچ کر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی وجہ سے ہم نے فارسی پر توجہ دی۔ اس سے پتہ چلا کہ غزل میں تو بہت امکانات ہیں۔ پھر جیل خانہ آگیا۔ چار برس ہم نے جیل میں گزارے۔ وہاں انکشاف ہوا کہ غزل تو بہت اچھی چیز ہے۔ اس کے ذریعہ آپ وہ بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ جو آپ چھپا کر کہنا چاہتے ہیں۔ نظم [illegible] زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ محنت غزل میں بھی ہوتی ہے لیکن غزل میں سارے اوزار پہلے سے موجود ہیں نظم میں ترصیع کا سارا کام آپ کو کرنا پڑتا ہے۔ غزل میں صرف یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کا نسخہ، ترکیب استعمال کیا ہے اور وہ کافی مشکل چیز ہے یعنی ایک طریقے سے یہ آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ سارا مسالہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ اور مشکل اس لیے کہ اس مسالے کو اس طریقے سے برتا جائے کہ یہ نظر نہ آئے کہ آپ نے اتنا گھیرا پن کیا ہے۔ اس سے دو فائدے ہیں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کریں گل و بلبل کی باتیں، گلشن کی، دربان کی اور قفس کی باتیں اور لوگ سمجھ جائیں کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ آپ نہایت گھسی پٹی ترکیب اور امیج لے کر تھوڑی سی جستجو سے بالکل اوریجنل بنا سکتے ہیں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس پر گرفت نہیں ہو سکتی آپ نے خالص سیاسی شعر لکھا ہے اس میں قاتل، مقتل، زنداں اور قفس کا ذکر ہے اگر کوئی گرفت کرنا چاہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے تو روایتی انداز سے غزل لکھی ہے۔

سہیل: اس زمانے کی جو ترقی پسند تنقید تھی وہ تو غزل کے ان امکانات کو نہیں پہچانتی تھی۔

فیض: وہ لوگ تو سخت خلاف تھے اس کے۔ بات یہ ہے کہ شروع شروع میں

جو ہمارے ترقی پسند تھے ان کی طبیعت انگریزی تھی۔ وہ سارے انگریز لوگ تھے۔ احمد علی ہوں یا سجاد ظہیر یا ملک راج آنند۔ ان کی ساری ذہنی تربیت انگریزی تھی۔ روایتی اور کلاسیکی غزل پر ان کی نظر نہیں تھی۔ بہت بعد میں انہوں نے اس طرف توجہ کی۔ شروع شروع میں ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

مسعود اشعر:۔ فیض صاحب آپ نے ترقی پسندوں کا ذکر کیا اور اپنی جیل کا بھی۔ خیر جیل تو بعد کی بات ہے۔ لیکن آزادی سے پہلے بھی جو ترقی پسند شاعری ہو رہی تھی۔ جیسے علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین حتیٰ کہ مجروح سلطان پوری بھی اپنی غزلوں تک میں ہی مار دھاڑ کر رہے تھے۔ آپ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ شاید اسے پسند ہی نہیں کیا۔ حالانکہ آپ اس تحریک میں برابر کے شریک تھے۔

فیض:۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہ جو دوست تھے۔ مجاز تھے۔ مخدوم تھے علی سردار جعفری تھے۔ خیر کچھ تو ہم ان کی طرح براہِ راست سیاست میں دخیل نہیں تھے۔ کچھ ہمارا خیال تھا کہ یہ ہنگامی شاعری ہے۔ وہ لوگ بھی بعد میں اس کے قائل ہو گئے۔ ہنگامی شاعری اور ایجی ٹیشنل شاعری کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن وہ ہوتا ہے وقتی۔ ہونا یہ چاہیے کہ دیرپا چیز سامنے آئے، جس میں صنعت اور فن کے تقاضے بھی پورے کیے جائیں۔ ایسی چیز پیدا ہو جو نظریہ کے اعتبار سے بھی صحیح ہو اور ساخت کے اعتبار سے، ہیئت کے اعتبار سے اور لغت کے اعتبار سے بھی اس میں پختگی ہو۔ اس پر ان سے ہمارا اختلاف رہا۔ چنانچہ ایک بہت بڑا فساد اس وقت ہوا۔ جب ہم نے جوش صاحب پر مضمون لکھا اور کہا کہ یہ انقلابی شاعری نہیں ہے اس پر علی سردار جعفری اور دوسرے دوستوں سے بڑی لعن طعن سننی پڑی۔ پھر جب پاکستان بنا تو ایک اور فساد ہوا۔

مسعود:۔ جی ہاں آپ کی نظم یہ داغ داغ اجالا پر تو دونوں طرف سے ہی.....

فیض:۔ ہاں۔ دونوں طرف سے ہنگامہ ہوا۔ پھر جب یہاں ترقی پسند تنظیم قائم کی گئی تو وہی قصہ دہرایا گیا۔ پہلے لوگوں نے غزل کو طلاق دے دی تھی۔ اب یہ سوال پیدا ہوا۔ کون ترقی پسند ہے۔ اور کون نہیں اور جو ہمارے ساتھ نہیں.....

سہیل: جی ہاں، بائیکاٹ کیا گیا ادیبوں کا رسالوں میں۔

فیض: منٹو راشد اور...... ہم نے کہا بھئی۔ ہم یہ سب نہیں مانتے چنانچہ

یہاں بھی ہمارا اختلاف رہا کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ ادب اور ترقی پسندی کو ایک دوسرے کا حریف نہیں بنانا چاہیئے۔ بلکہ ترقی پسندی کے لیے تو لازم ہے کہ ادب کے تقاضے پورے کیے جائیں ورنہ یا ترقی پسندی پیچھے رہ جائے گی یا ادب۔

جاوید شاہین:۔ فیض صاحب آپ نے ہیئت کی بات کی ہے۔ آپ کی جوانی کے دنوں میں انگلینڈ میں ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ اور ییٹس وغیرہ کا بہت چرچا تھا۔ موضوع کے لحاظ سے نہ سہی لیکن ہیئت اور ٹیکنیک میں ان کا بہت اثر تھا تو کیا فارم وغیرہ کے سلسلے میں آپ نے ان سے بھی اثر قبول کیا؟

فیض: ہاں کیا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ باہر جو ادب ہے۔ اس کا اپنا ایک تسلسل ہے اس کی وسعتیں اور اس کی جہتیں کسی حد تک محدود ہیں اس کی اپنی روایت ہے اب انگلستان اور یورپ کا جو ادب ہے اس کا پس منظر ہمارے ادب سے بالکل مختلف ہے وہاں پر جس طریقے سے ہیئت، لغت یا ڈکشن میں جو تبدیلیاں یا اضافے ہوتے ہیں اس کے لیے جو روایت چلی آرہی ہے اس میں داخلی طور پر ہوتے ہیں۔ ہمارے نئے لکھنے والوں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنی روایت سے الگ ہو کر ایک خارجی پیرایہ اختیار کرلیں جس سے جوڑ نہیں بنتا تال میل نہیں بنتا ہماری روایت کے ساتھ۔

مسعود: آپ کی مراد نثری نظم سے ہے؟

فیض: نثری نظم بھی ہے ایک چیز۔ لیکن نثری نظم سے پہلے بھی ایسی باتیں ہوئی ہیں۔ آپ ہماری لوک شاعری کو لے لیجیے۔ اس میں ہزار طرح کے سانچے ہیں۔ ہزار طرح کے نمونے موجود ہیں، ہیئتیں موجود ہیں۔ جن کو آپ تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

ہمارے عروض اور عربی عروض کا ماخذ تو ایک ہے لیکن ہمارا عروض وہ نہیں ہے جو عربی کا ہے۔ آپ عربی شعر موزوں پڑھ ہی نہیں سکتے۔ ہم نے عربی عروض میں اتنی رعایات ڈالی ہیں کہ اس کی صورت ہی بدل ڈالی۔ اگر اساتذہ یہ کام کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ لیکن اسے لوگوں کے ذہن سے اتنا دور نہ لے جائیں کہ انہیں جو تھوڑی بہت دلچسپی ہے وہی ختم ہو جائے۔ نثر کی بات دوسری ہے لیکن شاعری جو ہے اس میں ایک لذت کا پہلو بھی تو ہے۔ اس میں عیاشی کا پہلو بھی تو ہے۔ وہ بھی قائم

رہنا چاہیئے۔

جاوید شاہین: فیض صاحب، پچھلے دنوں ایک اخبار میں آپ کا انٹرویو چھپا تھا اس میں نثری نظم کے حوالے سے آپ نے بات کی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ کے ذہن میں اس کا کوئی اچھا تاثر نہیں ہے۔ حالانکہ آپ نے جن مغربی شاعروں کے حوالے دیئے ہیں انہوں نے پروز پوئم بھی لکھی ہیں۔

فیض: بات یہ ہے کہ یا تو نظم کہو یا نثر، یہ نثری نظم کیوں کہتے ہو۔ اگر وہ شاعری ہے تو شاعری ہے نثر ہے تو نثر ہے۔ میں نے کہا تھا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے مجھے اس سے اختلاف نہیں ہے البتہ اس اصطلاح سے اختلاف ہے۔

مسعود: اگر وہ وزن اور بحر میں نہیں ہے تب بھی؟

فیض: بار وزن اور بحر میں نہیں ہے۔ وزن ایک چیز ہے آہنگ یا ردھم دوسری چیز جس کو ہم وزن کہتے ہیں وہ تو ایک عربی تصور ہے۔ حالانکہ وزن صرف وہی نہیں ہے۔ جو عربی عروض کا ہے۔ وزن سے مراد تو صرف یہ ہونا چاہیئے کہ آہنگ یا لَے یا کسی قسم کا ترنم۔ پنجابی شاعری میں وارث شاہ تو عروض میں ہے لیکن ہماری جو بولیاں ہیں وہ تو عروض میں نہیں ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاعری نہیں ہے یا اس میں وزن نہیں ہے۔ اس میں وزن ہے لیکن وہ اپنا ہے۔ بغیر وزن کے، بغیر آہنگ کے تو کوئی شاعری ہی نہیں ہو سکتی یہ ضروری نہیں ہے کہ متعین یا رسمی یا روایتی اوزان اور سانچے جو ہم تک پہنچے ہیں ان کے مطابق ہی شاعری کی جائے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ نیا آہنگ یا نئی لَے پیدا کرنا چھوٹے موٹے شاعروں کا کام نہیں ہے۔ اس میں کوئی بڑا شاعر آئے گا تو وہ یہ آہنگ پیدا کرے گا۔ ابھی ایک تلاش ہے۔ ممکن ہے کچھ نکل آئے۔

منور حفیظ: یہ نیا اسلوب تلاش کرنے کی بات ہے؟

فیض: ہاں: یہ بات ضرور ہے۔ مثلاً ہم نے جب شاعری شروع کی یا راشد نے جب شاعری شروع کی تو انہوں نے اپنا آہنگ اور اسلوب تلاش کیا۔ اب اس وقت جو تجربات ہو رہے ہیں ممکن ہے اس میں کچھ نکل آئے۔

مسعود: فیض صاحب، آپ مغربی شاعروں کے اثرات کی بات کر رہے تھے۔

فیض: ہاں انگریزی کی شاعری بلکہ ہمارے اوپر سب سے زیادہ جس شاعر نے اثر کیا

وہ براؤننگ تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمارے کورس میں تھا دوسرے پڑھانے والے تھے۔ پطرس بخاری براؤننگ سے ہم نے براہِ راست ایک چیز لے لی ہے اور وہ ہے ڈرامیٹک مونولاگ، کہ بات کسی کی ہو رہی ہے لیکن واحد متکلم ہیں ....

سہیل: فیض صاحب، اس میں ایک اضافہ کر دیجیے کہ آپ نے آہنگ کا جو خاص نظام اپنایا ہے اس کے پیچھے بھی کسی کا اثر ہے؟ کیونکہ وہ بھی ایک منفرد سا ہے آپ جس طرح لفظوں کی تکرار کرتے ہیں اور لفظوں کے جوڑے بناتے ہیں .....

فیض: دو باتیں ہیں، ایک تو لفظوں کی صوت کا مسئلہ ہے کیونکہ شاعری میں لفظ اور معنی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ہی بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ جنہوں نے صوت کی طرف توجہ کی ہے۔ اور وہ تھے غالب۔ کسی نے ان کی شاعری کے اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ وہ اس معاملے میں بہت ہی صنّاع ہیں۔ الفاظ کی اصوات مرتب کرنے میں انہوں نے بہت ہی مہارت سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو ہمارے سامنے غالب تھے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا صنّاع ہے حافظ۔ یہ قصہ وہاں سے چلتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے۔ تو ہمارے دوست خواجہ خورشید انور نے ہمیں موسیقی کا شوق لگا دیا۔ ہم نے بڑے بڑے اساتذہ کو سنا۔ استاد برکت علی خاں، راشد علی خاں اور توکل حسین خاں وغیرہ حالانکہ موسیقی کا فن جو ہے اس کا شاعری کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں، تعلق اس قدر ہے کہ آدمی کے کان اتنے حساس ہو جائیں کہ وہ جان لے کہ کوئی لفظ بے سُرا تو نہیں ہے۔ جیسے گانے کا سُر ہوتا ہے ویسے ہی شعر کا بھی ہوتا ہے۔ جیسے گانے میں غلط سُر لگ جائے تو آدمی بے سُرا ہو جاتا ہے ایسے ہی لفظ غلط آ جائے تو......

اس پر لوگ عام طور سے توجہ نہیں کرتے۔ تو کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ انگریزی شاعروں کی وجہ سے ہمارے ہاں نغمگی پیدا ہوا۔ ایک اور بات ـــــ آپ دیکھیں گے کہ جسے استعارہ کہتے ہیں وہ ہمارے ہاں ہوتا ہی نہیں۔ یعنی اگر آپ نے کسی آدمی کو شیر کہہ دیا تو سب کو پتہ ہے کہ مراد آدمی ہی ہے۔ اس طرح وہ استعارہ نہیں رہا۔ ہمارے ہاں سب سے پہلے اسے متعارف کرایا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس نے ایجاد کیا۔ غالب نے ارادتاً فارسی سے رشتہ جوڑ کر جنت نگاہ اور فردوس گوش کہا۔ انگریزی میں چونکہ اس کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اس لیے ہم نے کچھ ادھر اور کچھ ادھر کیا پھر یہ بھی دیکھا کہ لفظوں کے صرف معنی ہی نہیں ہوتے صوت بھی

ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دونوں چیزیں ملاکر بات کی۔

جاوید شاہین : فیض صاحب اگر اجازت ہو تو اب گفتگو کو پھیلا دیا جائے آپ نے ابھی سارتر سے ہی ملاقات کا ذکر کیا ہے اس میں سارتر نے کہا تھا کہ یورپی ملکوں خصوصاً سوشلسٹ ملکوں کے پاس اب وہ موضوعات نہیں ہیں جو ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کے پاس ہیں اس لیے ان ملکوں میں بڑا ادب پیدا کرنے کے زیادہ امکانات ہیں نسبت ان ملکوں کے جہاں خوش حالی آگئی ہے۔ اور جہاں لوگ مطمئن ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے یہ بات درست ہے؟

فیض : یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس وقت الجزائر کی لڑائی جاری تھی۔ اور سوشلسٹ ملکوں کا ذکر نہیں تھا۔ سارتر نے کہا تھا کہ بڑی لڑائی کے بعد یورپ کے سرمایہ دار ملکوں کے پاس کوئی بڑا موضوع نہیں رہا۔ موضوع ہے مشرق کے پاس۔ لیکن ٹیکنک وغیرہ ہمارے پاس ہے۔ اس صدی کا سب سے بڑا ادب اس وقت پیدا ہوگا۔ جب یہ دونوں چیزیں۔ یعنی مشرق بلکہ تیسری دنیا کے موضوعات اور مغرب کی ٹیکنک ملے گی۔ اس وقت ایسا شاہکار پیدا ہوگا جسے ہم کہہ سکیں یہ شیکسپیر یا ٹالسٹائی کے مقابلے کی چیز ہے۔ یہ بات آج سے بیس سال پہلے کی ہے اب تو ان کے ہاں بڑا موضوع موجود ہے اور وہ ہے ایٹمی جنگ۔ اس سے بڑا مضمون تو آج تک کسی کے تصور میں ہی نہیں آیا۔

منو حفیظ : فیض صاحب، اب یہ بھی بتا دیجیے کہ کیا بڑا ادب محض اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب زندگی میں ناآسودگی اور پریشانی ہو۔ خوش حالی کے دور میں اچھا ادب پیدا نہیں ہو سکتا؟

فیض : نہیں، یہ بات غلط ہے بات یہ ہے کہ موضوع یا بڑا موضوع اتنا وسیع ہونا چاہیے۔ اور اس قدر ہمہ گیر ہونا چاہیے اور اس میں اتنی گنجائش ہونی چاہیے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ لافانی ہو۔ اس کے لیے فلاکت اور نکبت کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ زندگی کا اتنا بڑا سامنے آئے کہ وہ ہمہ گیر ہو۔ ایٹمی جنگ فلاکت اور نکبت کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ ایک اور مضمون ہے تسخیر کائنات کا۔ موضوع تو یہ ابتدا سے موجود ہے۔ لیکن آج کل اس کی ذرا زیادہ وضاحت بیدا ہوئی ہے۔ اب شیکسپیر کے زمانے کو لیجیے۔ وہ زمانہ تھا جب انگلستان کی سلطنت میں توسیع ہو رہی تھی اور انگلستان کو ایک عالمی طاقت بننے کا

خیال پیدا ہو رہا تھا۔ وہ فلاکت و نکبت کا زمانہ نہیں تھا۔ اس وقت شیکسپیر لکھ رہا تھا
اسی طرح کئی زمانے گزرے ہیں۔ ویت نام اور الجزائر کی لڑائی کا موضوع ایسا تھا جس
میں انسانی جذبات اور احساسات کے اظہار کے لیے ایک کھلا میدان بنتا ہے۔ اگر کوئی
تبدیلی کی منزل اس قسم کی نظر آئے جو اتنی بڑی ہو۔ تو بات ہی ہو جاتی ہے۔ فلاکت
اور خوش حالی کی بات نہیں ہے۔ موضوع بڑا ہونا چاہیئے۔

سہیل: ایک قصہ سوشلسٹ حقیقت نگاری کا بھی ہے۔ اس کے بھی کئی رخ ہیں
ابھی کچھ عرصے پہلے رسالہ سوویت لٹریچر میں ایک چینی ڈرامے پر تبصرہ تھا۔ اس میں جہاں اس
ڈرامے پر نظریاتی تنقید کی گئی تھی وہاں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ پراپیگنڈہ ہے اور یہ آرٹ نہیں
بنتا۔ اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ترمیم پسندی کا شاخسانہ ہے۔ یا پھر ہم یہ سمجھیں کہ اس
تمدن نے اپنی شروع کی انتہا پسندی پر قابو پا لیا ہے اور اعتدال حاصل کر لیا ہے۔ اگر یہ بات
درست ہے تو ہمارے ہاں کے ترقی پسند ابھی تک ۱۹۳۶ء کی فضا میں کیوں رہتے ہیں وہ
ابھی تک اسی انداز کی باتیں کیوں کرتے چلے آ رہے ہیں۔

فیض: ترقی پسندوں کے بارے میں اس قدر تعمیم نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ایسے
بھی ہیں جو اس قسم کی باتیں نہیں کرتے۔

مسعود: ترقی پسند بھی تو اب دو قسم کے ہو گئے ہیں۔ ایک ۱۹۳۶ء والے
ترقی پسند اور دوسرے نیو ترقی پسند نئی نسل کے بہت سے ادیب بھی اپنے آپ کو ترقی
پسند کہتے ہیں۔

فیض: دیکھیئے، یہ تو ہمیشہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندی جب شروع ہوئی تھی تو وہ بالکل
نیا موضوع تھا۔ چنانچہ اس میں پوری طرح رچاؤ اور اس کا پورا ادراک پیدا ہونے سے
پہلے اس میں انتہا پسندی آ گئی۔ اسی طرح پاکستان بننے کے بعد جب ترقی پسند
تنظیم بنی تو اس میں بھی وہی انتہا پسندی پیدا ہوئی حالانکہ اس وقت تک ترقی پسند تحریک کو
دس بارہ سال ہو چکے تھے اور بہت سے لوگ اس زمانے کی تھوڑی بہت غیر محتاط باتوں
سے گریز کر چکے تھے۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ آج بھی اس قسم کے رجحانات پائے جاتے
ہیں۔ تو بھئی۔ اس چیز کی تو کوئی ضمانت دے ہی نہیں سکتا کہ ہر وقت ہر آدمی معقول
بات کرے۔

سہیل: وہ جو سوشلسٹ حقیقت نگاری کی بات تھی اس بارے میں کیا خیال ہے؟
فیض: اس بارے میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں یہ سن ۹۴۳ کی بات ہے۔ لینن گراڈ میں یوروپی ادیبوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ یوروپی ادیبوں سے مراد صرف ترقی پسند یا بائیں بازو کے ادیب نہیں۔ اس میں سب شامل تھے۔ وہاں یوروپ کے بعض ادیبوں نے کہا کہ آپ کے ہاں جو ادب پیدا ہوتا ہے وہ ادب کہاں ہے محض پراپیگنڈہ ہے۔ اس پر ایلیا اہرن برگ نے جواب دیا یہ ٹھیک ہے ہم نے ٹالسٹائی اور چیخوف پیدا نہیں کیے لیکن ہم نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے جو تم لوگ ہزار سال میں بھی پیدا نہیں کر سکے۔ ہم نے بہت بڑا پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔ تم نے اب تک جتنی کتابیں چھاپی ہیں ہم ایک سال میں چھاپ لیتے ہیں۔ ایک تو یہ۔ دوسرے ہم نے جب انقلاب برپا کیا تو ہم نے اس کی ضمانت دی تھی کہ مزدور کا استحصال نہیں ہوگا۔ اور کاشت کار پر ظلم نہیں ہوگا۔ ہم نے یہ ضمانت کب دی تھی کہ ہم بڑا ادب پیدا کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ابتدا میں جب سوشلسٹ حکومت قائم ہوئی تو ایک ادیب میرے ساتھ ایک کارخانے میں گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ لوگوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیئے جو ان کی سمجھ میں آئے تو تم ان کے لیے لکھتے ہو یا نہیں؟ انہوں نے کہا یہ میرے معیار کے لوگ نہیں ہیں۔ میں ان کے معیار کے مطابق نہیں لکھ سکتا۔ پھر پچھلے سال میں انہیں پھر ایک کارخانے میں لے کر گیا اور میں نے وہاں لوگوں سے پوچھا کہ تم ان کی کتابیں پڑھتے ہو؟ تو لوگ کہنے لگے کہ ہم نہیں پڑھتے، یہ ہمارے معیار کے نہیں ہیں۔

سہیل: ویسے اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا تعلیم اس کی وجہ ہے یا اس کا تعلق اجتماعی سائیکی سے ہے۔

فیض: دونوں ہی باتیں ہیں۔ لوگوں کا معیار بھی بدل جاتا ہے۔ آپ لکھنا شروع کرتے ہیں ایک قسم کے لوگوں کے لیے۔ پھر ان کا معیار بدل جاتا ہے۔ ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے لازمی بات ہے کہ آپ جتنا بھی کہیں کہ میں اپنے لئے لکھتا ہوں لیکن آپ کے ذہن میں پڑھنے والا یا کوئی سننے والا ضرور رہتا ہے۔ اور آپ کو شعوری طور سے یا لاشعوری طور سے اس کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ ضرور کرنی پڑتی ہے۔ جب پڑھنے والا بدلتا ہے تو اس کے لکھنے والے کی تحریر پر بھی اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ سوشلسٹ ملکوں میں جو صورت حال آج سے پچاس برس پہلے تھی، وہ تو اب نہیں ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ ایک زمانے میں سوشلسٹ

حقیقت پسندی کا جو تصور تھا وہ بدل گیا ہے۔ پراپیگنڈہ اور ادب میں اب یہ فرق ہو گیا ہے کہ اگر کسی تحریر میں وہ جہت موجود ہے جسے ہم AES THETIC کہتے ہیں تو وہ ادب ہے۔ اگر وہ نہیں ہے تو پراپیگنڈہ ہے۔

مسعود: فیض صاحب آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ اگر کوئی منزل اور کوئی گول سامنے ہو تو اچھا ادب پیدا ہوتا ہے، تو مایوسی، محرومی DESPAIR اور تشکیک کے ادب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

فیض: اس بارے میں بھی دو باتیں ہیں۔ یعنی تشکیک بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک منفی اور ایک مثبت، ایک تو منفی تشکیک ہے جس کے ذریعے آپ منفی ادب پیدا کرتے ہیں۔ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ایک مثبت تشکیک ہوتی ہے۔ جس میں واقعی کسی چیز کو QUES TION کرتے ہیں، اس کے بارے میں تجسس، تفتیش اور تحقیق کرتے ہیں اسے حقیقت سے اور واقعہ سے الگ نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ وہ بھی ایک طرح کا احتجاج ہے صورت حال کے خلاف اگر احتجاج واقعی جانبدارانہ ہے اور اس میں خلوص اور جذبہ ہے تو وہ ٹھیک ہے لیکن اگر وہ محض منفی چیز ہے تو اس میں کوئی بات کوئی جان ہی نہیں ہوگی۔

سرور حفیظ: ایک طبقہ اب بھی مقصدی ادب کی بات کرتا ہے کہ اپنے گاؤں اپنی تہذیب اور اپنے مذہبی عقائد کو شعوری طور پر پیش کیا جائے۔

فیض: بات وہی ہے اگر آپ اپنے گاؤں اپنی تہذیب یا اپنے مذہب کے ساتھ ذہنی اور جذباتی طور پر وابستہ ہیں تو وہ خود بخود ادب بن جائے گا۔ اگر نہیں اور آپ محض ثواب کے لیے لکھ رہے ہیں تو ادب نہیں بنے گا۔ اگر دل سے بات نکلی ہے تو صحیح ہے۔ اگر کسی کے کہنے سے لکھا ہے تو وہ ادب نہیں ہے۔

سہیل: فیض صاحب، اب ایک ہلکا پھلکا سوال۔ آپ کو بہت سے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے آپ نے بہت سے شہر دیکھے ہیں۔ ان کے پہاڑ، دریا، ساحل آپ کی شاعری میں بھی ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ یہ بتائیں گے کہ کس شہر نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

فیض : بھئی ، روایتی جواب تو یہ ہے کہ لاہور۔ لیکن بڑا مشکل ہے۔ کچھ کہنا۔ اس وجہ سے کہ کبھی ایک صورت پسند آتی ہے ، تھوڑی دیر بعد دوسری صورت نظر آجاتی ہے تو لگتا ہے کہ یہ زیادہ اچھی ہے۔ یہ وقتی طور پر ہوتا ہے اگر ہم غور کریں کہ ذہن پر نقش کس کا باقی ہے تو سب سے زیادہ نقش تو کشمیر کا ہے۔ اس کے بعد پھر گرا بڑا ہے پیرس بھی ہے طغلسی بھی ہے ۔ سمرقند و بخارا بھی ہے ۔

مسعود : شخصیتوں کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہے ۔

فیض : شخصیتوں کے بارے میں یوں ہے کہ کچھ تو ایسے تو لوگ ہیں جن سے مراسم رہے (انہیں چھوڑ دیجئے جنہیں کتابوں میں پڑھا) لیکن ذاتی طور پر جن کا نقش ذہن میں بہت گہرا ہے تو بزرگوں میں سے تو ایک ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں اگر ہم نے قلندر دیکھا ہے تو وہ ذاکر حسین خاں تھے۔ دوسری سیاسی شخصیت تھی شیخ عبداللہ کی غفار خاں سے ہم ملے نہیں ۔ گاندھی جی سے بھی نہیں ملے ۔ قائد اعظم سے سرسری ملاقات ہوئی نہرو صاحب سے ہم ضرور ملے لیکن ان کو ہم اس صف میں شامل نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے وہ بہت شگفتہ شخصیت تھے۔ پھر لکھنے والوں میں ایک تو سارتر ، ناظم حکمت اور پھر ہمارے استاد ہیں، سب سے قریب صوفی تبسم اور پطرس بخاری اور ان سب سے زیادہ تاثیر ،

منور حفیظ : سیاسی شخصیتوں میں یاسر عرفات کے آپ بہت قریب رہے ۔

فیض : ہاں - ایک یاسر عرفات ہیں

مسعود : اب آخر میں آپ یہ بتا دیجئے اب کیا پروگرام ہے آپ کا ۔

فیض : بھئی ، نظم کے لیے تو کسی پروگرام کی ضرورت نہیں ہوتی ویسے ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم کیا شروع کریں۔ اتنے سال باہر رہنے کی وجہ سے پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب کچھ تو کوشش کر رہے ہیں کہ پچھلے چار پانچ سال کا BACK LOG کلیئر کریں۔ چنانچہ پچھلے دو تین سال کے رسائل اور کتابیں منگائی ہیں تاکہ اس عرصہ تک جو کچھ لکھا ہے اسے صاف کیا جائے۔ پھر ذہن میں بہت سی باتیں ہیں ابھی کچھ
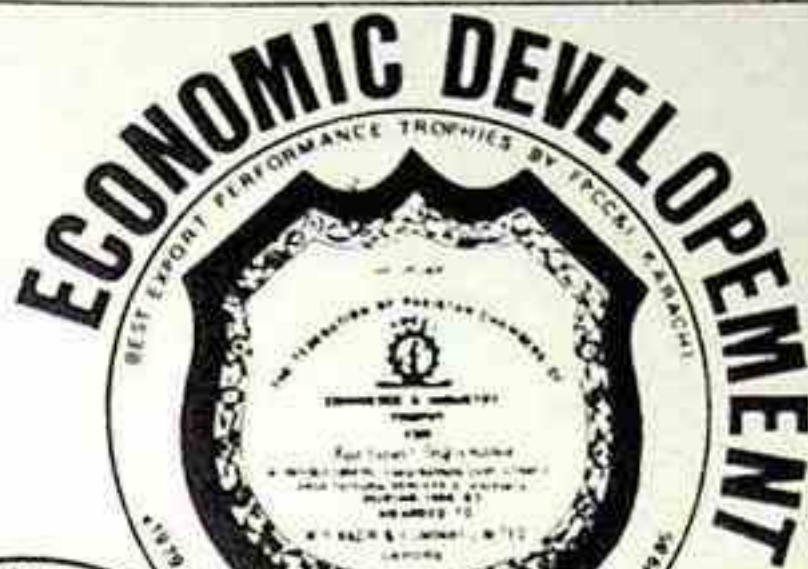
انٹرویو۔ کرشن گولڈ

فیض کا آخری انٹرویو

"میں کرکٹر بننا چاہتا تھا"

پاکستان جانے سے پہلے فیض احمد فیضؔ نے بی بی سی کے ایشیائی پروگرام کے لئے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا تھا جو پروگرام کے پروڈیوسر جناب کرشن گولڈ نے کیا تھا۔ یہ فیض صاحب کا آخری انٹرویو ہے۔

کرشن: فیض صاحب! ابھی حال ہی میں ایک انٹرویو میں آپ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ یہ بتایئے کہ ایسے کون سے سوال ہیں جو آپ سے نہ پوچھے جائیں لیکن میں اس کے بالکل برعکس کہنا چاہتا ہوں آپ نے سینکڑوں ہزاروں انٹرویو دیئے ہیں آپ ایسے سوال بتائیں جو آپ نے ہمیشہ سوچا ہو کہ کاش مجھ سے کوئی پوچھے اور میں اس کا یہ جواب دُوں۔ ایسا کوئی سوال ہے؟

فیض: بھئی بات یہ ہے کہ ہم تو انٹرویو وغیرہ دینے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ہمارا کام تو صرف لکھنا ہے۔ ہم سے کوئی کیا سوال پوچھتا ہے۔ کیوں پوچھتا ہے ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ جو بھی کوئی سوال کرے ہم جواب دینے کو تیار ہیں۔ آپ پُوچھ رہے ہیں کہ کوئی ایسا سوال جو ہم سے کرنا چاہیے تھا اور ہمیں اس کا جواب دینا چاہیے تھا۔ یہ ذرا سوچنے کا مجھے موقع دیجئے۔ اگلا سوال کیجئے۔

کرشن: آپ نے ابھی کہا ہے کہ میرا کام لکھنا ہے اچھا تو پھر یہ بتا دیجئے، آپ نے شعر لکھنا کب شروع کیا تھا۔

فیض: شعر تو شاید ہم نے بچپن ہی میں تک بندی شروع کر دی ہوگی۔ جس کا ہم نے کبھی کوئی ریکارڈ نہیں رکھا۔ لیکن سنجیدگی سے ہم نے اُس وقت لکھنا شروع

کیا تھا جب ہم گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ یہ بات ۱۹۲۹ء کی ہے جب ہم تھرڈ ائر میں پڑھتے تھے۔ جب پہلا مشاعرہ ہوا گورنمنٹ کالج لاہور میں۔ کالج کے اس مشاعرے میں شہر کے نامور شعرا حضرات تشریف لائے تھے۔ آج کل جو فرشی مشاعرے کا رواج چل نکلا ہے اس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کالج میں ایسا ہوتا کہ جو بڑے بڑے شاعر ہوتے تھے، وہ اسٹیج پر کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور جو ہمارے جیسے ابھی شاعر بننے کی کوشش میں ہوتے تھے، وہ سامعین میں بیٹھتے تھے۔ اور باری باری ان کو پکارا جاتا تھا۔ تو ہم نے مشاعرہ میں پڑھنا تو گورنمنٹ کالج میں ہی شروع کیا تھا۔ پہلی بار جو ہم نے غزل پڑھی تو بہت داد ملی۔ اس مشاعرے کی صدارت پطرس بخاری صاحب کر رہے تھے۔ پہلے دَور میں بہت داد ملی تو دوسرے دَور کے لئے بھی ہمیں بلایا گیا۔ مگر ہمارے پاس تو صرف ایک ہی غزل تھی۔

ایک بار ہمارے ایک دوست برزخ مومن نے اپنے ایک دوست کے نام ایک منظوم خط ہم سے لکھوایا تھا جو کہ ہم نے ایک نظم کر کے لکھ دیا تھا —— ہم نے مجبوراً دوسرے دَور میں وہ منظوم خط پڑھ دیا۔ اس کے بعد مشاعرہ ختم ہوا تو چراغ حسن حسرت، صوفی تبسم اور عبدالمجید سالک جیسے بلند پایہ صاحبِ سُخن اور اہلِ قلم ہمارے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے دِل کو بہت چوٹ لگی ہے۔ میں نے کہا "جی ہاں لگی تو ہے۔" کہنے لگے "ہاں بھئی! رنگ بہت اچھا ہے شعر کہا کریں" ہم نے سمجھا کہ ہم تو واقعی شاعر ہوگئے ہیں جو اس قسم کے چوٹی کے لوگ ہمیں سراہ رہے ہیں۔ یہ ہے ہمارے شعری سفر کا آغاز۔

کرشن: ابھی آپ نے کہا کہ کسی زمانے میں آپ تک بندی کیا کرتے تھے اُس زمانے میں کبھی خیال آیا تھا کہ آپ شاعر بنیں گے؟

فیض: کبھی بھی نہیں۔ اُس وقت تو ہم کرکٹر بننا چاہتے تھے۔ اپنی خواہشات کا دائرہ یہاں تک ہی محدود تھا۔

کرشن: شاعری کے علاوہ آپ پروفیسر بھی رہے اور اخبار کے ایڈیٹر بھی۔ آپ فوج

میں بھی رہے ان سب کے باوجود آپ کا شاعری سے ناتا برقرار رہا۔ یہ بتایئے متذکرہ ملازمتوں میں آپ کیسے چلے گئے۔ مثلاً فوج میں آپ کیوں اور کیسے گئے؟

فیض: جب جرمن نے روس پر حملہ کر دیا اور جاپانی ہندوستان تک پہنچ گئے تو ہم نے سوچا کہ اب تو فاشزم کا سوال ہے۔ یہ انگریزوں کی حمایت کا سوال نہیں ہے وہ ایک عالمگیر تحریک تھی۔ فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں۔ تب ہم نے سوچا کہ ہمیں فوج میں شامل ہونا چاہیئے اور جمہوری قدروں کی بحالی کے لئے ہمیں بھی ہاتھ بٹانا چاہیئے

کرشن: اس کے بعد پھر آپ نے سیاست میں بھی حصّہ لیا؟

فیض: سیاست میں تو ہم نے فوج میں جانے سے پہلے ہی حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ جب ہم ۱۹۳۵ء میں امرتسر میں پڑھاتے تھے تو ہمارے ساتھ ایک ہمارے رفیقِ کار تھے۔ رام پور سے صاحب زادہ محمود الظفر ان کی بیگم تھی ڈاکٹر رشیدہ جہاں۔ وہ لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی ایک ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور اب چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم کی جائے۔ کیا تمہیں اس میں کوئی دلچسپی ہے تو ہم نے کہا ہاں! ہم ضرور کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا زمانہ تھا۔ اور عاشقی وغیرہ کا مرض بھی لاحق تھا۔ بیگم رشیدہ جہاں نے کہا چھوڑ یہ عاشقی وغیرہ کے چکر' سب فضول بات ہے۔ دُنیا کے دُکھ جو ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ یہ تمہارا عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے۔ اور انہوں نے ہم کو سکھایا کہ اپنا غم جو ہے یہ تو بہت معمولی سی چیز ہے دُنیا بھر کے دُکھ دیکھو اور اپنے لوگوں کے اپنی قوم کے اور اپنے ملک کے۔ ان کی بپتا کے بارے میں تمہیں سوچنا چاہیئے۔ اگر اپنے لئے سوچتے رہو گے تو یہ خود غرضی کا عمل ہوگا۔ چنانچہ یہ شعر ہمارے اُسی زمانے کی یادگار ہے۔

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

کرشن: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آپ جیل میں تھے وہ زمانہ آپ کی شاعری کا سب سے زرخیز زمانہ تھا؟

فیض: یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ جیل خانے میں اور کوئی مصروفیت نہیں تھی کوئی اپائنٹمنٹ نہیں ہوتی تھی ۔ جیل کا زمانہ ایسا ہی ہے جیسا پھر سے عشق کر لیا جائے ۔ جیسے عشق میں خواہ مخواہ شعر بنتے چلے جاتے ہیں ۔ انسان جذبات کی رو میں بہہ کر کہتا ہی چلا جاتا ہے ۔ جیل خانے میں بھی ایسا ہی ہے جیسا آپ نے دوبارہ عشق کر لیا ہو ۔ جیل میں میرا یہ عشق شاعری سے تھا ۔

کرشن: عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ نے انتہائی بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری ہے کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں ؟

فیض: بھرپور تو ٹھیک ہے لیکن کامیاب ہم نہیں کہہ سکتے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر پانچ یا چھ سال کے بعد انسان کو اپنا کام بدل لینا چاہیئے جیسے ہم نے پہلے پانچ سال پڑھایا پھر پانچ سال فوج کی نوکری کی ۔ پھر اس کے بعد پانچ یا چھ سال صحافت کی نذر کر دیئے ۔ اس کے بعد پانچ سال جیل خانے گئے ۔ اس کے بعد ہم نے کلچرل کام کیا ، چار سال باہر گزارے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آدمی کو کسی ایک رٹ میں نہیں لگا رہنا چاہیئے ۔

کرشن: کوئی ایسا کام جو آپ کرنا چاہتے تھے اور وہ نہیں ہوا ؟

فیض: ایسے تو بہت سے کام ہیں جو ہم کرنا چاہتے تھے اور نہیں ہوئے اور ایسے بہت سے کام بھی ہیں جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے اور وہ ہم نے کر دیئے ۔ ہم سمجھتے ہیں جو کام ہمیں کرنا چاہیئے تھے وہ ہم اس لیئے نہیں کر پائے کہ ہمیں وہ کام کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ۔ مثلاً ہم یہ چاہتے تھے کہ شاعری کو چھوڑ کر ادب خاص طور پر اُردو شاعری کے سیاسی ، اقتصادی اور سماجی رشتوں کے بارے میں جم کے بیٹھ کر کچھ لکھیں آخر غزل کیسے اور کیوں بدلتی رہی ۔ مختلف زمانوں میں مثلاً ناول نے کیسے اور کیوں جنم لیا ۔ انگریزوں کے آنے کے بعد نقشہ کیسے بدلا وغیرہ ہمارے ہاں ادبی تاریخ تو کافی لکھی گئی ہے لیکن وہ سب سطحی ہے ۔ اس میں ادبی معاملات پر غور کیا گیا ہے اور ادب کے جو معاشرتی اقتصادی اور سیاسی رشتے ہیں ان پر زیادہ غور نہیں کیا گیا ۔ ہم چاہتے تھے کہ یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر اس خلاء کو پُر کر لیا جائے ۔ یہ کافی لمبا اور محنت طلب کام ہے جو

ہم ابھی تک نہیں کر سکے ۔

کرشن: نوجوان شاعروں کو آپ شاعری کے بارے میں کیا مشورہ دیں گے ؟

فیض: شاعری کے بارے میں تین مشورے ہیں ۔ پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ جو کچھ لکھو اپنے دل سے لکھو ۔ کسی کے کہنے کی وجہ سے مت لکھو ۔ دباؤ میں آکر مت لکھو ۔ ثواب کی خاطر مت لکھو ۔ حتیٰ کہ سیاست کی خاطر بھی مت لکھو ۔ جو دل سے بات نکلتی ہے وہی لکھو ۔ اگر دل سے بات نہیں نکلتی تو مت لکھو ۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی ذات تو حقیر سی چیز ہے ۔ اندر سے تم کیا نکال لوگے ۔ اندر جو کچھ ہے وہ تو باہر ہی سے آتا ہے ۔ تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باہر کیا ہے تو باہر کی بات کے تین حلقے ہیں ایک تو آپ کی اپنی ذات کا حلقہ ہے آپ پر خود کیا گزری اور آپ پر جو گزری ہے اس کا آپ کے لوگوں اور آپ کے قوم پر کیا اثر ہوا ہے ۔ اِن مناظر میں آپ حالات کا جائزہ لیں ۔ یہ تو تین اہم سرکل ہیں جن پر انسان کی نظر ہونی چاہیئے اور دوسرا آپ کو اپنے ماضی حال اور مستقبل پر بھی نظر رکھنی چاہیئے ۔ یہ امر مدِ نظر رہنا چاہیئے کہ ماضی سے ہمارا کیا رشتہ تھا ؟ حال میں ہم کیا کر رہے ہیں اور مستقبل میں ہمیں کون سے راستے پر چلنا ہے ان پر بھی نظر رکھنی چاہیئے ۔ پھر جاکر کہیں بڑی شاعری بنتی ہے جس سے معاشرے کی خدمت ممکن ہوتی ہے ۔

کرشن: آخر میں ، میں فیض صاحب ! آپ سے درخواست کروں گا کہ اپنا کوئی تازہ کلام سُنایئے ۔

فیض: ابھی ہم گھر گئے تھے کوئی پانچ چھ مہینے ہوئے تو وہاں جو کچھ ہم نے دیکھا اور جو ہم پر گزری وہ ہم عرض کئے دیتے ہیں ۔

نہیں وصال میسّر تو آرزو ہی سہی — نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی — نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی — گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل

مرتب : سُلطان محمود

تمام رنگ اب RIB میں بھی دستیاب

بشیر احمد چودھری

نقشِ فریادی کی اشاعت — ادبِ لطیف کی ادارت اور فیض احمد فیض

اس جہانِ فانی میں اپنا نقش ودام ثبت کر کے آخر فیض احمد فیض بھی لگے جہان سدھار گئے جہاں جاکر کوئی واپس نہیں آتا۔ میں بشیر احمد چودھری فیض احمد فیض صاحب کا پہلا پبلشر ہوں جس نے "نقش فریادی" شائع کی۔ فیض صاحب چند سال "ادب لطیف" کے مدیر رہے۔ ادب لطیف ہندوستان بھر کے رسائل میں سرفہرست اور مقبولیت کے مقام پر تھا۔ موصوف کی ادارت میں ادب لطیف نے مزید عزت وشہرت پائی۔

فیض صاحب کی ادارت میں چھپنے والا ادب لطیف کا سالنامہ ۱۹۴۲ء ضبط ہوگیا اس خاص نمبر میں اس زمانے کے تمام اہم لکھنے والوں کی تحریریں، نظم ونثر، افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین موجود تھے جن میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "کالی شلوار" اور بمبئی کالج میں پڑھا جانے والا صدارتی خطبہ، عصمت چغتائی کا "لحاف"، ممتاز مفتی کا "بدماش" خاص طور پر اعتراض کا باعث بنے۔ ان دنوں "ادب لطیف" کی ظاہری شکل وصورت سادگی کے باوجود اس قدر دیدہ زیب تھی کہ ہندوستان بھر کے رسائل وجرائد رشک سے دیکھا کرتے۔

فیض صاحب ہیلی کالج آف کامرس میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ نئے نئے اورنٹیل کالج میں بھی کلاس لینے لگے تھے اور موصوف کی رہائش میاں میر نہر کے کنارے مسلم ٹاؤن کے پاس تھی ادارتی ڈاک اور دوسرے امور کے ضمن میں موصوف کے پاس ہفتہ میں ایک دو بار جانا پڑتا تھا موصوف اپنی مرضی اور فرصت کے لحاظ سے روز دفتر ادب لطیف دسرکلر روڈ بیرون بھاٹی گیٹ چلے آتے اور کبھی کبھی کئی دن کے ناغے کے باعث ضروری ڈاک اور بعض مضامین کے ضمن میں اور کتابت شدہ میٹریل اور نئی ڈاک کے سلسلہ میں کسی نہ کسی کو بھیجنا یا خود جانا ایک طرح سے ضرورت بن گیا تھا

"نقش فریادی" (پہلے مجموعہ کلام) کی اشاعت کا معاہدہ انہی صحبتوں میں طے پایا اور مسودہ کتابت کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ "مکتبہ اردو" اور ادبِ لطیف کی کتابت ملک کے نامور خطاط کرتے رہے

تھے، اور کر رہے تھے، اس سب کے باوجود برادرم چوہدری نذیر احمد کی نظر ایک نوجوان محمد حسین، پر ٹکی تھی۔ جو نظم کے اچھے کاتبوں میں شامل ہو رہے تھے، اور لوہاری دروازے کے پاس نیا بازار میں تاریخی ڈونگی مسجد کے قریب رہائش رکھتے تھے۔

مسودہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت تو نہ تھی کہ بہت خوبصورت لکھا ہوا تھا، البتہ ناشر کے فریضہ کے طور پر اس کو دیکھنا اور کے 'ہیں' سے یا نقاط کی غلطیوں کا دور کرنا ضروری جانا جاتا ہے۔ بھائی جان نے یہ کام میرے سپرد کیا جس کا انجام یہ ہوا کہ مجھے ایک طرح سے سارا کلام از بر ہو گیا۔ جس میں میری کوئی خوبی نہ تھی فیض کے کلام کا ہی ایجاد تھا۔

کتابت ہونے پر فیض صاحب نے ایک بار خود دیکھا اور پروف پڑھنے کی ذمہ داری میرے ذمہ لگا دی۔ میں نے بڑی احتیاط سے پروف پڑھے (وہ لیتھو پریس کا زمانہ تھا) اور اپنے سامنے اغلاط کی صحت مصحح سنگ دِسنگساز سے کرائی۔

کتاب کے لئے بہترین کاغذ کا انتخاب کیا گیا جو اس سے پہلے لیتھو پریس میں کبھی استعمال نہ ہوا تھا۔ صرف ٹائپ میں چھپنے والی کتابوں پر ہی استعمال ہوا کرتا تھا۔ سرپور بیپر ملز کا "انٹیک پیپر" بہت نفیس آیا تھا۔ ۱۱۲ صفحے کی کتابت موٹے کاغذ پر کم صفحات کے باوجود موٹی نظر آ رہی تھی کتابت پر نرم لچکدار کپڑے کی جلد بنی تھی اور اس پر سنہری ڈائی سے مصنف اور کتاب کا نام شائع کیا گیا تھا مصور جناب عبدالرحمٰن چغتائی سے کتاب کا گردپوش بنوایا گیا تھا جو کئی رنگوں پر مشتمل تھا، اشاعت سے پہلے کئی بار مختلف رنگوں میں پروف نکلوا کر دیکھے گئے اور پھر رنگوں کا انتخاب عمل میں آیا۔

کتاب ہر طرح سے تیار ہو چکی تھی کہ مجھے کتاب میں ایک غلطی کا علم ہوا۔ اور میں نے اعلان کر دیا کہ جب تک کتاب کی واحد غلطی کی تصحیح نہ ہو جائے کتاب فروخت کے لئے نہیں دی جائے گی دو دن تک غلطی کی تلاش رہی اور کسی کو وہ غلطی نظر نہ آئی جو میرے علم میں آ چکی تھی۔

مصنف اور کار پردازان (چوہدری برکت علی صاحب و چوہدری نذیر احمد صاحب) کا اصرار تھا کہ کوئی غلطی نہیں ہے اور کتاب فروخت کے لئے پیش کر دی جائے۔ اور اگر غلطی ہے تو اس کی نشاندہی کی جائے۔

اب میں نے اپنی جانب سے یہ شرط عائد کر دی کہ اگر میں اس واحد غلطی کی نشاندہی کروں تو کس انعام کا مستحق ٹھہروں۔ نتیجتاً فیض صاحب نے دس روپے اور چچا مرحوم برکت علی صاحب

نے بھی دس روپے انعام دینے کا وعدہ فرمایا۔

میں نے واحد غلطی کی نشاندہی کی جو یہ تھی

کتاب پر کتاب کے نام والے صفحہ پر مصنف کا نام فیض احمد فیضؔ جہاں لکھا گیا تھا اُس میں ہر دو فیض پر تخلص کے نشان (ـؔ) کاتب نے لگا دیئے تھے۔

یہ غلطی بظاہر معمولی غلطی تھی حالانکہ بڑی اہم غلطی تھی۔

ساری کتاب میں پہلے فیض کے لفظ پر سفیدہ لگا کر (ـؔ) نشان کو گاڑھے سفیدے میں چھپا دیا گیا۔ کیونکہ بلیڈ سے لفظ رگڑنے سے کاغذ پر چھید پڑ جاتا تھا۔

میں نے اگست ۴۲ء میں مکتبہ اردو اور ادب لطیف کو چھوڑ کر "مکتبہ جدید" کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ جس کے بعد مصروفیات یکسر بدل گئیں اور نئے کاروبار کو ذریعہ معاش بننے کے قابل بنانے میں تن من دھن سے کوشاں ہو گیا۔ انہی ایام میں فیض صاحب بھی ادب لطیف کی ادارتی ذمہ داری چھوڑ گئے اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان ٹائمز پریس سے منسلک رہے۔ پنڈی سازش کیس میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے کے مراحل طے ہوتے رہے۔

البتہ اس دوران جب میں نے مکتبہ جدید کی جانب سے قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے" شائع کیا اور فیض صاحب سے کتاب پر ان کی رائے طلب کی تو موصوف نے نہ صرف ناول کی غیر معمولی تعریف کی بلکہ مجھے کلیات فیض چھاپنے کی اجازت اور اس مد میں کچھ رقم بھی ایڈوانس حاصل کی۔ (اس وقت تک نقش فریادی کے علاوہ دو تین مجموعے طبع ہو چکے تھے)

کلیات کی اشاعت کا پروگرام اس طرح تو تجویز پایا کہ جناب عبدالرحمٰن چغتائی "دیوان غالب" کی طرح کلام فیض کو مصور کریں گے اور اس طرح یہ مجموعہ مصنف کی حیات میں الیسٹریشنز کے ساتھ طبع ہو۔

قدرت کے کاموں میں اور انسان کے ارادوں میں اکثر یکرنگی پیدا نہیں ہو پاتی۔ قضاء و قدر کے اپنے پروگرام ہوتے ہیں جب کہ انسان ناکارہ کے اپنے ارادے۔

فیض صاحب پنڈی سازش کیس میں قید ہو کر ساہیوال جیل میں تھے۔ میرے پہنچنے پر موصوف نے بتایا کہ چودھری عبدالحمید صاحب مکتبہ کارواں والے تم سے کئی دن پہلے مجھے ملنے آئے تھے۔ اور موصوف سے کتابوں کی پہلی صورت میں ہی اشاعت کا معاملہ ہو گیا ہے اور انہوں نے نہ صرف مجھے میری ضرورت کی اشیاء مہیا کی ہیں بلکہ میرے گھر پر بھی اس ضمن میں رقم پہنچا دی ہے۔ لہٰذا کلیات

کی اشاعت کا پروگرام فی الحال ملتوی کر دوں۔

حالات کی سنگینی کے پیش نگاہ اپنے ساتھ کیئے گئے معاہدے پر اصرار ترک کر کے میں واپس چلا آیا۔

فیض احمد فیض سے میری منیجری کے زمانہ میں ادب لطیف نے بڑی شہرت پائی، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، ملک راج انند، جوش، مجاز، جذبی، سجاد ظہیر، سلام مچھلی شہری، مولانا چراغ حسن حسرت، کنور محمد اشرف، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، دیویندر ستیارتھی اور کتنے ہی ترقی پسند اور غیر ترقی پسند نئے ادبا نے اپنے رشحات قلم سے ادب لطیف کے حلقۂ اثر کو بڑھایا۔ علمی بحثیں چلیں، جواب الجوات افسانے لکھے گیے، شاہد لطیف اور عصمت چغتائی ان سب نے ادب لطیف میں لکھا ان میں سے اکثر کی کتابیں مکتبہ اردو سے طبع ہوئیں۔ ان میں سے ایک اور واقع ایسا ہے کہ اس کا ذکر ضروری اور دلچسپ تجربے کا حامل ہے

ن م راشد کی "ماورا" کا دیباچہ کرشن چندر نے لکھا اور فیاض محمود صاحب افسانوں کی کتاب کا دیباچہ بھی کرشن چندر نے لکھا تھا، فیض صاحب نے اسرار الحق مجاز کی کتاب "آہنگ" کا دیباچہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ جوش صاحب کے دواوین کی اشاعت ہو چکی تھی، مجاز کی کتاب چھپی رکھی تھی، دیباچے کے لئے چند صفحات مخصوص کرائے گئے تھے، اس طرح ایک سال دیباچے کے انتظار میں گذر گیا۔ جنگ عظیم دوم زوروں پر تھی اور ملک میں سیاسی بیداری کی لہر اٹھی ہوئی تھی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سبھی کتابوں اور اخبارات کے مطالعہ میں دلچسپی لے رہے تھے، پورے ہندوستان میں ادب لطیف اور مکتبہ اردو کی مطبوعات کے چرچے تھے، کتابیں ضبط ہوتی تھیں، رسالے پر مقدمات بنتے تھے، نجس اور کتابیں ایک ساتھ چلتی تھیں، جن جن مصنفین نے ان دنوں ادب لطیف میں لکھا وہ تب اور اب ملک میں نامور ادیب کے مقام پر کھڑے ہیں۔ کتابوں کی تعداد فروخت بڑھ رہی تھی، پہلے جو کتاب چار یا پانچ سال میں ایک ہزار کاپی بکتی تھی اب چار چھ مہینے اس کا ایڈیشن ختم ہو جاتا۔ جن کتابوں کی تشہیر "ادب لطیف" میں کی جاتی ان کے لئے براہ راست بھی اور ملک بھر کے تاجران کتب کی جانب سے آرڈر آجاتے تھے۔

"آہنگ" کے ضمن میں بھی کافی آرڈر آچکے تھے، چند سیاسی ورکر بھی کتاب فروشی کے پیشہ میں سرگرم تھے، حضرو اور راولپنڈی میں دو شخص بہت زیادہ سرگرم عمل تھے، انہوں نے "آہنگ" کی فوری طلب کے ساتھ دو دو سو کاپی کے لئے پیشگی رقم فراہم کر کے کتاب ایک ہفتہ میں مہیا

کرنے کے لئے تقاضا کیا۔

گرمیوں میں مکتبہ اردو کے کارپرداز پہاڑ پر چلے جایا کرتے تھے سارا کام میرے ذمہ رہتا تھا۔ میرے لیے آسانی تھی کہ کسی سے خصوصی اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی میں مجاز تھا جو چاہوں کرلوں۔

فیض صاحب سے دیباچے کا تقاضہ برابر جاری تھا مگر وعدوں پر پھر وسہ کب تک، پھر کتاب بغیر دیباچے کے خریدنے والے موجود تھے، میں نے پروگرام بنایا، دیباچے والے صفحات کو کتاب کی فہرست، غزلیات، انتساب وغیرہ سے مکمل کرکے پہلا فرمہ شائع کرلیا ——اب کتاب میں فیض صاحب کے دیباچے کی بجائے۔

کتاب کا انتساب: "فیض احمد فیض کے دیباچے کے نام" —— تھا اور کتاب کی سیل شروع کردی۔

ایک کاپی چودھری برکت علی صاحب کو اور ایک کاپی چودھری نذیر احمد صاحب کو شملہ اور بارہ مولہ دکشمیر کے پتوں پر بھیج دی جب کہ ایک کاپی محترم فیض صاحب کی خدمت میں بھی پہنچادی۔

ہفتہ دس دن کے وقفہ میں چچا جان چودھری برکت علی کی جانب سے سخت ناراضی کا خط موصول ہوا جب کہ اسی دن فیض صاحب بھی دیباچہ دے گئے۔

موصوف نے مجھے دیباچہ لکھوانے میں مدد دینے پر شاباش دی میں نے موصوف کو بتایا کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن مکمل طور پر ختم ہوگیا ہے اور اب دوسرا ایڈیشن دیباچہ کے ساتھ طبع ہوگا۔ میں اکثر یاد کرتا ہوں ـ کتنا بھلا زمانہ تھا۔ کنور محمد اشرف کی کتاب "لینن"، باری علیگ کی کمپنی کی حکومت، سوشلزم، "مشین اور مزدور" اور "کمیونسٹ مینی فیسٹو" جیسی کتابیں چھاپ کر انگریز دشمنی کا پرچار کیا اور روس دوستی کا اظہار، کیونکہ حکومت وقت کو روس سے بڑا خطرہ تھا۔

ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت میں جو کام اس وقت ہوا اس نے سیاسی طور پر ملک کو بیدار کردیا۔ چھوٹی چھوٹی کتابوں نے لوگوں کے ذہنوں میں الاؤ روشن کردیئے، عبداللہ ملک نے "سرمایہ داری" لکھی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اقبال اور اس کا پیغام کسی نے ٹرانسکی لکھی تو کسی نے عصمت الولو، اتاترک، نہرو اور گاندھی، رضا شاہ پہلوی، کسان اور مزدور،

پنجاب گورنمنٹ کا شعبہ پریس برانچ "ادب لطیف" اور "مکتبہ اردو" کے مالکان سے ناراض تھا

سرکاری اہلکار دن رات اس ٹوہ میں لگتے رہتے کہ کیا چھپ رہا ہے اور کہاں چھپ رہا ہے۔ مقدمات بنتے مگر اللہ کی حکمت سے سب فیصل ہو جاتے۔ پریشانی آتی مگر جانے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ مصنفین مبیئی سے ملیح آباد اور لائلپور سے عدالتی کارروائی کے نتیجہ میں لاہور آتے، ضمانتیں پیش کی جاتیں، خوف وہراس ہر دقت دامن گیر رہتا۔ مگر حوصلے بلند ہونے کے باعث کتاب کوئی نہ پکڑی جاتی۔ نہ پکڑی گئی، ہر کتاب اور رسالہ بندش کے حکم کے دن سے پہلے فروخت ہو چکتا۔ سرکاری اور پولیس اہلکار ایک کاپی بھی برآمد نہ کر پاتے۔ اس طرح جواز نکلتا کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔

آزادی کے بعد بھی حکومتوں نے اپنے ادیبوں پر پابندی جاری رکھی اور کبھی کوئی ریڈیو اور ٹی وی پر نہ آسکتا۔ مگر شاباش ہے ان حوصلہ مندوں کو جنہوں نے مصنفین کی آواز کو دبنے نہ دیا۔ غلامی کے دور میں بھی اور اب آزادی کے دور میں بھی ان کے رشحات قلم کو قارئین تک پہنچانے میں کسی خوف اور سزا کی پرواہ نہیں کی۔

جیسا کہ عوام کو معلوم ہے نہ پہلے حکومتیں ناشرین کی قدردان تھیں نہ اب حکومت ناشرین کو بحیثیت ناشر قدر کی نظر سے دیکھتی ہے اسے فقط لکھنے والوں میں سے بعض کو اپناہم خیال بنانے اور ان کی ذہنی تخلیقات کا رخ بدلنے پر خرچ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور اس طرح کی مختلف انجمنیں اور ادارے بنا کر قلمکاروں کو ستائش باہمی کے ذریعہ القابات، انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ نہ کتابیں خریدی جاتی ہیں، نہ ناشرین کو اچھی کتابوں کی پیشکش پر کسی تعریف کا مستحق گردانا جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب
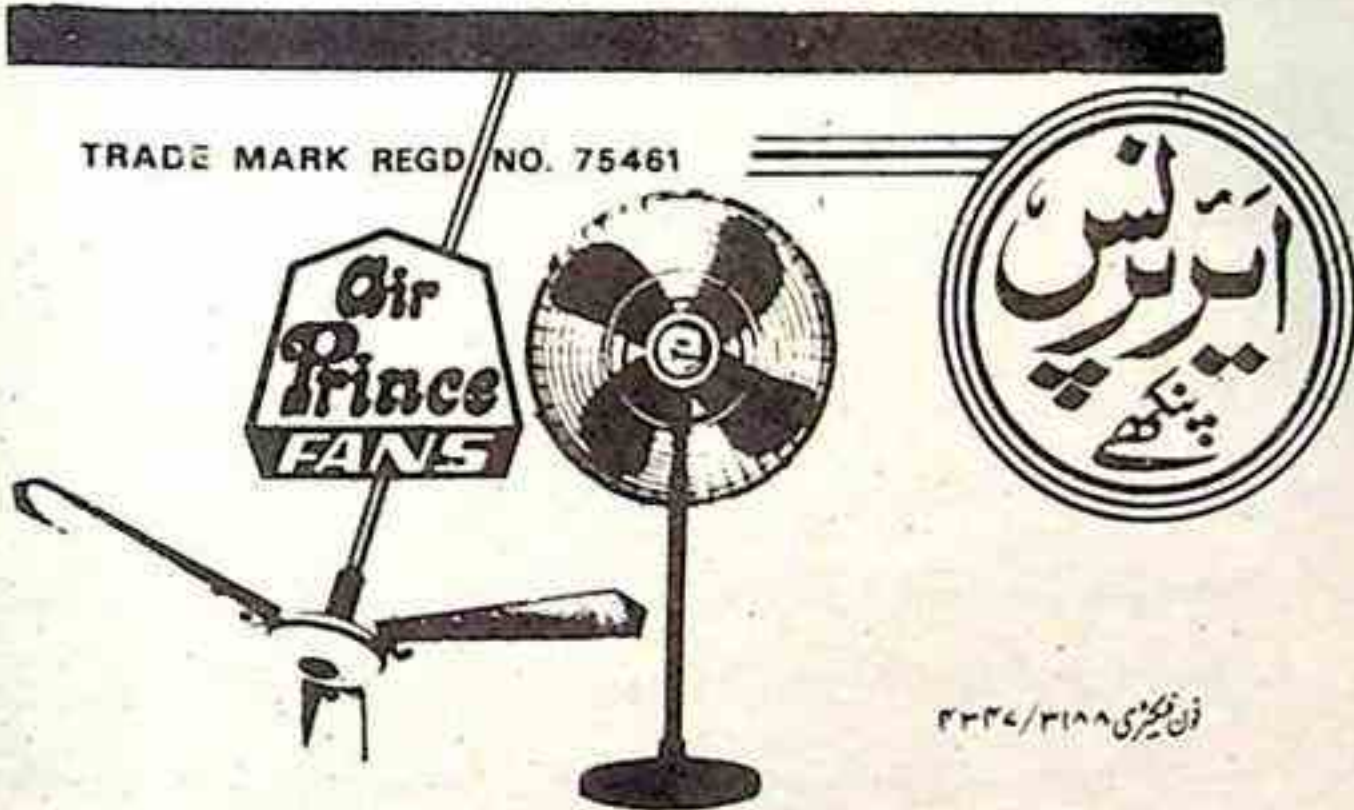
بیادِ فیض

ثقافت، صحافت، شاعری اور ادب کے حوالے سے فیض احمد فیض کی یاد پر پھولوں کی چادر چڑھانا تو ان شعبوں کے ماہرین کا حق ہے، جو آج کی اس محفل میں پوری پوری طرح ادا کر چکے ہیں۔ میرے پاس تو فقط ان کے ساتھ نیازمندی کی چند یادوں کا سرمایہ ہے۔ میری اس نیازمندی کو نہ تو کبھی گہری دوستی کا درجہ حاصل تھا، نہ ہم جلیس کا، نہ ہم خیال کا۔ میرا ان کے ساتھ آشنا رشتہ تھا۔ کہ میں ان کی دل سے عزت کرتا تھا اور وہ میرے ساتھ مروت سے کام لیتے تھے۔ اس بے نام سے رشتے کا آغاز اتفاقاً ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا، جو پورے پینتالیس برس اس ہلکی سی برقی CURRENT کی طرح قائم رہا جو بالوں میں کنگھی کرنے سے پیدا تو اکثر ہوتی ہے، لیکن اس سے جھٹکا کبھی نہیں لگتا۔

۱۹۳۹ء میں جب میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے۔ کا امتحان دیکر فارغ ہوا تو میرے استاد پروفیسر ڈکنسن نے کہا: "کینیرڈ کالج میں انگریزی کی ایک LEAVE VACANCY موجود ہے۔ میں نے پرنسپل سے بات کر لی ہے۔ تم فوراً جا کر ڈیوٹی JOIN کر لو۔"

میں خوشی خوشی سر آنکھوں کے بل کینیرڈ کالج پہنچا، تو محاورے کے عین مطابق سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ایک کلاس روم میں داخل ہوتے ہی اس زمانے کی صاحبزادیوں نے ایسی نعرے بازی کی، اور چاک کے ٹکڑوں، مونگ پھلیوں، کھٹی میٹھی گولیوں اور کاغذی گولوں کی ایسی بوچھاڑ کی، کہ میں کلاس روم ہی نہیں بلکہ کالج چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

انہیں دنوں کسی نے بتایا کہ مرتہ کے اسلامیہ کالج میں بھی LEAVE VACANCY کے طور پر کوئی جگہ خالی ہے۔ وہاں پہنچا، تو ایک نہایت خوش جمال، خوش لباس اور خوش گفتار

نوجوان نے بتایا کہ جگہ پر ہو چکی ہے۔ اس نوجوان کا نام فیض تھا۔ فیض صاحب ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے خالباً یونہی رسماً پوچھا کہ کسی اور جگہ پڑھانے کا تجربہ بھی ہے یا نہیں؟ میں نے فوراً گیرڈ کالج کا ایک روزہ تجربہ بیان کر دیا۔ یہ سن کر فیض صاحب لڑکیوں کی طرح جھینپ جھینپ کر مسکراتے رہے اور باہر آ کر مجھے الگ سے سمجھایا کہ آئندہ کسی امر ویو میں اپنا یہ تجربہ ہرگز بیان نہ کرنا۔ اسی روز سے ہمارے درمیان دوستی کا ایسا رشتہ استوار ہو گیا جس میں وقت کے ساتھ میری اور فیض کی دوستی بڑھتی گئی۔

جس زمانے میں فیض صاحب لاہور آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر تھے۔ جسٹس ایس اے رحمان مرحوم نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ اگر صدر مملکت اس ادارے کو کسی وقت وزٹ کر لیں تو ممکن ہے کہ اس کے کام میں چند مقامی رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ صدر تو بخوشی مان گئے لیکن گورنر کالا باغ نے خود آنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں منانے کی کوشش کرنے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو ان کے پاس پنجاب پولیس کا ایک نامی گرامی افسر بیٹھا تھا نواب صاحب نے دو ٹوک جواب دے دیا کہ وہ ایسے "کنجر خانوں" میں جانا پسند نہیں فرماتے۔ صدر صاحب کو بھی وہاں مت لے جاؤ۔ فیض احمد فیض کے متعلق اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار فرمانے کے بعد انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے پولیس افسر کی طرف اشارہ کر کے کہا "فیض کے لیے میں نے یہ السیشین پال رکھا ہے۔ صدر کے دورے کے بعد اسے چھوڑ دوں گا ..."

پولیس افسر نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنی دم ہلائی۔ اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنی غیر مشروط وفاداری کا یقین دلایا۔

میں نے فیض صاحب کو یہ واقعہ سنایا، تو وہ اپنے دستور کے مطابق مسکرا کر چپ ہو رہے۔ البتہ تھوڑے سے عرصہ بعد وہ نہایت خاموشی سے آرٹس کونسل سے رخصت ہو گئے۔

ایک بار ایسے ہی سنکی میں آ کر میں نے وزارت اطلاعات و نشریات میں ایک کلب قائم کیا جس کا نام I DO NOT AGREE CLUB. رکھا۔ اس کی پہلی تقریب میں جو حضرات شامل ہوئے ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ شورش کاشمیری صاحب مجید نظامی صاحب، میر خلیل الرحمن صاحب۔ غلام احمد پرویز صاحب کے علاوہ پندرہ

بلیں دیگر مشاہیر بھی شامل تھے۔ سید مودودی صاحب کو یہ تقریب اس قدر بھائی کہ انہوں نے اردو میں اس ادارے کا نام "بیں نہ مانوں کلب" بھی تجویز کر دیا۔ ایک اگلی میٹنگ کے لیے میں فیض صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے شرکت کی حامی بھر لی، اور گفتگو کا موضوع DISSENT IN ART AND LITRATURE. مقرر کیا

ہم لوگ "بیں نہ مانوں کلب" اس تقریب کے لیے مدعوئین کی فہرستیں تیار ہی کر رہے تھے، کہ اوپر سے حکم نامہ آگیا، کہ یہ خرافات بند کرو،

اس تقریب میں بات چیت کے لیے فیض صاحب نے جو NOTES. تیار کیے تھے، وہ انہوں نے میرے حوالے کر دیے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ دو ڈھائی صفحات چھ برس سے اوپر میرے پاس پڑے رہے۔ پھر ۱۹۶۸ء میں میں نے یہ کاغذات ان کو واپس لوٹا دیے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس برس مئی کے مہینے میں ہم لوگوں نے وزارت تعلیم میں ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں اس وقت کے پاکستان کے دونوں حصوں سے میدان ثقافت کے نمائندوں، تنظیموں، اداروں اور آرٹ کونسلوں نے بھرپور شرکت کی تھی کانفرنس نے ایک STANDING COMITTEE ON ART AND CULTURE قائم کی جس کے چیئرمین فیض احمد فیض مقرر ہوئے۔

اسی روز شام کو فیض صاحب مجھے ملے، اور پوچھا کہ تم نے کمیٹی اور اس کے چیئرمین کے متعلق اوپر سے CLEARANCE. لے لی ہے یا نہیں؛

میں نے جواب دیا، کہ اگر میں پہلے CLEARANCE. حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو غالباً نہ ملتی۔ اب کمیٹی قائم ہو گئی ہے، تو شاید چل نکلے۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ میری تھوڑی بہت جواب طلبی تو ضرور ہوئی۔ لیکن کمیٹی کو کسی نے نہ چھیڑا۔ فیض صاحب اس کمیٹی کو ساتھ لے کر پشاور سے چٹاگانگ تک بیسیوں جگہ گئے اور تین سو سے اوپر فن کاروں، ادیبوں، دانشوروں و ماہرین ثقافت سے تبادلہ خیالات کیا۔ چھ سات ماہ بعد جب ان کی رپورٹ مرتب ہو کر وزارت تعلیم میں پہنچی، تو صدر ایوب کی حکومت کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی کو اتنا ہوش نہ تھا، کہ وہ اس رپورٹ پر غور کر کے اسے منظور یا نامنظور کرتا۔ اس کے بعد پہلے ایک حکومت ٹوٹی۔ پھر مشرقی پاکستان ٹوٹا۔ پھر دوسری حکومت ٹوٹی۔ پھر تیسری حکومت ٹوٹی اور اب یہ معلوم نہیں کہ وہ رپورٹ،

اپنی اصلی صورت میں کہیں موجود بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ پس منظر تبدیل ہو چکا ہے، تاہم اس رپورٹ کے بعض حصے آج بھی غور طلب ہیں۔

۱۹۷۲ء میں جب PAKISTAN NATIONAL COUNCIL OF THE ARTS قائم کیا گیا تو فیض صاحب نے چیئرمین کے طور پر اس کی سربراہی قبول کر لی۔ دفتری ضابطے کے RULES OF BUSINESS کے مطابق بعض معاملات میں اس ادارے کی فائلیں منظوری حاصل کرنے کے لیے وزارت تعلیم میں آیا کرتی تھیں۔ ایک روز فیض صاحب نے مجھے فون کیا کہ بہت ساری فائلیں جمع ہو گئی ہیں۔ میں انہیں لیکر تمہارے پاس کس وقت آجاؤں؟

فیض صاحب کے منہ سے یہ بات سنکر مجھے بے حد ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ میرے جیسے دو دو ٹکے کے بیوروکریٹ تو ہر حکومت کو ہر زمانے میں تھوک کے بھاؤ ملتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن فیض تو نہ جانے کتنی صدیوں کے لیے فقط ایک ہی فیض ہے۔ چنانچہ میں نے کبھی انہیں فائلیں لیکر اپنے پاس آنے کا موقع نہ دیا۔ میں وقتاً فوقتاً خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ اور جس فائل پر وہ جو جو احکام صادر فرمانا چاہتے تھے ان پر بلا چون و چراں دستخط کرتا تھا۔ میرے اس طریق کار کی وجہ سے یہ شکایت پیدا ہوئی، کہ منسٹری کا اس ادارے پر کوئی کنٹرول باقی نہ رہا۔ ایک دو نکتہ چیں وزیروں نے میرے اس عمل پر INEFFICIENCY اور NEGLIGENCE کی پھبتی بھی اڑائی۔ لیکن میں اپنی اس INEFFICIENCY اور NEGLIGENCE کو ہمیشہ خوش دلی سے قبول کرتا ہوں، اور اسے اپنے لیے ایک تمغۂ عقیدت سمجھتا ہوں۔

ایک بار مجھے فیض صاحب کے ساتھ ایک وفد میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے نیروبی جانے کا موقع نصیب ہوا۔ وہاں پر مہینہ بھر ہوٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ ان دنوں وہ ”پیام مشرق“ کا منظوم اردو ترجمہ کرنے میں ہمہ تن معروف تھے۔ نیروبی میں پنجابی کے ایک شاعر سردار سوہن سنگھ بھی رہتے تھے۔ وہ فیض صاحب کے شیدائی تھے، اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ گنواتے تھے۔ ایک شام وہ فیض صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ خوب خاطر مدارت کی اور نذرانۂ عقیدت کے طور پر انہیں ایک انگوٹھی کا تحفہ دیا، جس پر جلی حروف میں ”اللہ“

کا لفظ نقش تھا۔ واپس آکر فیض صاحب نے ہم سب کو بڑے شوق سے یہ انگوٹھی دکھائی کسی نے فقرہ چست کیا۔ "چلئے غنیمت ہے کہ نیروبی میں ایک سکھ نے آپ کو مسلمان تو سمجھا"

فیض صاحب مسکرا کر بولے۔ "یہ بھی ضروری نہیں، کچھ لوگ تو یہی سوچیں گے کہ سکھوں سے ایک تازہ لطیفہ سرزد ہو گیا ہے!"

مذہب اور سیاست پر فیض صاحب کے ساتھ میری کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دراصل میں نے ان کے ساتھ کسی موضوع پر بھی کبھی کوئی طویل گفتگو نہیں کی۔ ہالینڈ کے دارالخلافہ دی ہیگ، لندن اور نیروبی میں مجھے چند بار ان کی خدمت میں لگاتار کئی کئی گھنٹے اکیلے بیٹھنے کا موقع نصیب ہوا ہے —— ساحل پر بیٹھے ہوئے خاموش تماشائی کی طرح جو اپنے سامنے پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھتا تو ضرور ہے۔ لیکن نہ اس کی وسعت سے واقفیت رکھتا ہے، اور نہ اس کی گہرائی میں جگمگاتے ہوئے موتی اور مونگوں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فیض صاحب سمندر بھی ایسا تھے جس میں کبھی جوار بھاٹا اٹھتے نظر نہیں آیا۔

فیض صاحب جیسے حساس، شریف النفس، سلیم الفطرت، حلیم الطبع اور انسان دوست افراد معاشروں کی تہذیب و تمدن کا جوہر ہوتے ہیں۔ ان کی ایک یقینی پہچان یہ ہے کہ موت کی تاریکی ان کی یاد کو دن بدن روشن سے روشن تر کرتی رہتی ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم میں سے اکثر نے فیض صاحب کو ان کی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے ساتھ ملے جلے، بات چیت کی۔ اور آج جس ایوان میں یہ تقریب منا رہے ہیں، اس کے ساتھ ان کی نہایت طویل اور گہری یادیں وابستہ ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ رفتہ رفتہ اس مقام کا نام ہی فیض میموریل آرٹ اینڈ کلچر سنٹر زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ جب کبھی ایسا ہوا تو یہ زندہ دلان لاہور کی جوہر شناسی اور کشادہ دلی کا ایک اور زندہ ثبوت ہو گا۔

کرشن چندر

فیضؔ سے ملاقات

مئی ۱۹۶۷ء میں مجھے پہلی بار سوویت ادیبوں کی کانگریس میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ چینی ادیبوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر ملک کے مندوبین آئے تھے۔ ان مندوبین کی حیثیت سوویت ادیبوں سے مختلف تھی۔ ہم لوگ نہ ووٹ دے سکتے تھے۔ نہ الیکشن میں حصّہ لے سکتے تھے۔ سوویت ادیبوں کی کانگریس میں یہ حق اور بجا طور پر یہ حق صرف سوویت ادیبوں کو حاصل تھا، مگر دوسری تمام کارروائیوں میں ہم لوگ حصّہ لے سکتے تھے۔ پاکستان سے فیض احمد فیضؔ اور ہندوستان سے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔

FEDIN. فیدن کانگریس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ سوویت ادیبوں کی چوتھی کانگریس تھی۔ اراکین صدارت میں شولوخوف، بورس پولی والی، رسول گم زادے، میرزا ابراہیم، کربا بیائف اور دیگر یورپی اور ایشیائی سوویت ریاستوں کے مندوبین کو جگہ دی گئی تھی۔ کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں روسی حکومت، کے صدر اور روسی حکومت کا بینہ وزیرِ اعظم سمیت شامل تھی۔ جو بات مجھے اچھی لگی، وہ صرف یہ ہی نہ تھی کہ اس کانگریس میں شروع سے آخر تک ادیبوں کو اہمیت حاصل تھی۔ ہمارے ملک میں اوّل تو حکومت کی طرف سے ادیبوں کی کوئی کانفرنس ہی منعقد نہیں کی جاتی اور اگر کسی ادبی اجتماع میں وزراء شریک بھی ہوتے ہیں تو ڈائس پر انہیں سب سے آگے جگہ دی جاتی ہے اور ادیبوں کو پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ اخباروں میں صرف وزیروں کی تقریریں شائع ہوتی ہیں اور ادیب

اور کلچر کے متعلق کسی ادبی اجتماع میں کسی ادیب نے کیا کہا اسے ایک سِرے سے گول کر دیا جاتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے وزیر قابلِ احترام نہیں ہیں لیکن ادیبوں کی محفل اور ان کے ادبی اجتماع میں ادیبوں کی بحث و تمحیص کو زیادہ اہمیت حاصل ہو تو بہتر ہے۔ سوویت ادیبوں کی یہ کانگریس چار دن تک جاری اور ہر روز بیشتر سوویت اخبار اس کی کارروائیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ ہمارے یہاں کے اخبار اوّل تو ادبی خبروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اگر کسی ادبی اجتماع کی خبر چھاپتے بھی ہیں تو کسی غیر اہم صفحے پر یک کالمی سُرخی کے ساتھ۔ یوں کہنے کو تو ہم پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب اور کلچر کے وارث ہیں لیکن اس ملک میں کلچر اور تہذیب کے وارثین کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب شولوخوف تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو سارے ہال میں بیٹھے ہوئے مندوب مع روسی کابینہ اور وزیرِ اعظم ان کی عزت افزائی کے لئے کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ وہ لوگ اپنے ادیب کا منصب اور اس کی اہمیت پہچانتے ہیں اور اسے اپنے سماج میں قابلِ عزت مقام دیتے ہیں۔ شولوخوف کو تعظیم دے کر وہ لوگ دراصل اپنے ملک کے ادب اور کلچر کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے۔

یہ کانگریس ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے بعد منعقد ہوئی تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ حالانکہ میرے وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی مگر ممکن ہے منتظمین کے ذہن میں یہ بات رہی ہو۔ میں اور فیضؔ دونوں ہوٹل مسکوا میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مگر ایک دوسرے سے مُلاقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ پہلی شام جب میں مسکوا ہوٹل کے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں کھانے کے لئے گیا تو دیکھا کہ ہر ملک کے مندوبین کے لئے ایک میز الگ سے سجی ہوئی ہے اور اسی میز پر اس ملک کا ایک چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ میں نے دیکھا تو کہیں آس پاس پاکستان کی میز اور ہندوستان کی کم سے کم تیس اور میزوں کا فاصلہ تھا۔ میں مسکرا کر چپ رہا اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ فیضؔ ابھی میز پر نہ آئے تھے۔

پہلے پندرہ بیس منٹ مشروب پینے ہی گذرے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ

فیض کسی دوسرے دروازے سے داخل ہو کر اپنی میز کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے میری طرح چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ غالباً انہیں بھی کسی دوسری میز کی تلاش تھی۔ یکایک میری اور فیض کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے میں اپنی کرسی سے۔ اس وقت سارا ہال ہم دونوں کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر ہوا یہ کہ میں اپنی میز سے ہندوستان کا فلیگ لئے اٹھا اور فیض اپنی میز سے پاکستان کا فلیگ لئے اُٹھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہوئے میزیں پار کرتے ہوئے بیچ کی کسی میز پر آکر رُک گئے۔ اس میز پر ہم دونوں نے ہندوستان اور پاکستان کا جھنڈا ساتھ ساتھ لہرا دیا اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

سارا ہال تالی پیٹنے لگا۔

یہ تالی اس وقت تک بجتی رہی جب تک فیض اور اس کی ترجمان، میں اور سلمیٰ اور ہماری ترجمان ایرینا اس میز کے چاروں طرف بیٹھ نہ گئے۔

"کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ؟ ہم لوگ بھی کیا متعصب سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن ہیں؟۔

ادب میں دشمنی نہیں چلتی اور کاش کہیں کبھی نہ چلے"

میں نے کہا "مگر اس بدقسمتی کو کیا کہیے کہ تمہاری میری ملاقات اب نہ ہندوستان میں ہوتی ہے۔ نہ پاکستان میں۔ اور ہوتی ہے تو صرف ماسکو میں!"

اُن لوگوں کو چاہیے" فیض نے ہنس کر کہا" اپنے روسی ادیبوں کی کانگریس ہر سال منعقد کیا کریں۔ اسی بہانے مِل لیا کریں...." میری طرف جھک کر پوچھا۔ "تمہاری ترجمان تو بڑی خوبصورت ہے کہاں سے اُٹھنی؟"

میں نے کہا "بدل لو۔ مگر یاد رکھنا یہ یہودن ہے!"

ہم سب ہنسنے لگے۔ پھر جام سے جام ٹکرانے لگے۔ دو جھنڈے ساتھ لہرانے لگے۔ اتنے میں جنوبی افریقہ کے مشہور ناول نگار الیکس لاگوما ہاتھ میں کونی ایک کا جام اٹھائے ٹوسٹ پیش کرنے کے لئے ہماری میز پر آ گئے۔ پھر

کہیں سے رسول گم زادے کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ رسول گم زادے کا شمار سوویت شاعروں کی پہلی صف میں ہوتا ہے۔ ہندوستان آ چکے ہیں اور اردو کے صرف دو لفظ جانتے ہیں "مشہور شاعر" چنانچہ ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے اور منہ چومتے ہوئے بولے "مشہور شاعر فیض احمد فیض" "مشہور شاعر کرشن چندر" "مشہور شاعر سلمی صدیقی" پھر ہماری ترجمان کی طرف شوخ نگاہوں سے تاکتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "مشہور شاعر — ؟"

میں نے کہا۔ "ایرینا"

"ایری نچکا" رسول گم زادے نے اس نام کو اور بھی پیار سے لیا اور اس کے قریب کرسی گھسیٹ لی۔ پھر اور لوگ آتے گئے۔ تھوڑی دیر میں ہماری میز پر پانچ سات جھنڈے جمع ہو گئے تھے۔

اس کے بعد جتنے بھی دن ہم ہوٹل مسکوا میں رہے، میری اور فیض کی میز ایک ہی رہی۔ ہندوستان اور پاکستان ایک ہی میز پر کھانا کھاتے رہے۔

★

کانگریس میں اتنے ملکوں کے اتنے ادیبوں سے ملاقات ہوئی کہ نہ اب اُن کے نام یاد ہیں، نہ چہرے، صرف چند چہرے یاد ہیں۔ ان میں آنا سیگھرز کا چہرہ بہت نمایاں ہے۔ حلاوت میں ڈوبا ہوا ممتا بھرا چہرہ، سفید بالوں میں سیدھی مانگ اور بے ترتیب بال۔ بالکل ہندوستانی خاندان کی بڑھیا لگتی تھیں۔ اور شولوخوف، مجھ سے بھی پستہ قد، مگر فراخ ماتھا آئن سٹائن سے ملتا جلتا اور فلیکسن بال، چہرے پر گہری گمبھیرتا اور پابلو نرودا کا نیم ایشیائی نیم یورپی چہرہ۔ آنکھوں میں گہرا کرب لئے ایلیا ایرن برگ سے ملاقات نہ ہو سکی وہ ان دنوں اٹلی گئے ہوئے تھے۔ دوبارہ جب میں روسی ادیبوں کی پانچویں کانگریس میں گیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ روسی ادیبوں میں وہ سب سے زیادہ تیکھے اور نزاعیہ لہجے میں اپنی بات کہتے تھے۔ اس لئے بہت سے لوگ اُن سے خفا رہتے تھے۔ روسی ادیبوں میں وہ سب سے زیادہ کانٹی نینٹل تھے اور خاصے خود سر۔ ان سے بات کرنے میں مزہ آتا تھا۔ کیونکہ برسوں

پیرس میں رہ کر فرانسیسی مزاج کا رنگ بھی اُن کے اسٹائل میں داخل ہو چکا تھا۔ جیسے محض بات کرنے کی خاطر بات کرنا پسند ہے۔

★

روسی کانگریس میں روس کی تمام اہم زبان کے اُدب پر سیر حاصل تبصرے تو ہوئے ہی، لیکن ساتھ ہی ساتھ غیر ملکی نمائندوں کو بھی ان کے اپنے ملک کے اُدب پر تقریر کرنے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ وقت کم تھا۔ اور تقریباً تمام ملکوں کے نمائندے حاضر تھے۔ اس لئے انتخاب کرنا پڑا۔ ایشیا سے آرٹش منگولیا۔ جاپان شمالی کوریا۔ ویت نام۔ ہندوستان اور پاکستان کو چنا گیا۔ حرف میں نے تقریر کی۔ بعد میں میری تقریر ایک پمفلٹ کی صورت میں شولوخوف اور دوسرے دو روسی ادیبوں کے ساتھ شائع کی گئی اور یوں مجھے شولوخوف کے ساتھ چھپنے کا فخر حاصل ہُوا۔

★

کانگریس کی آخری کارروائی الوداعی ڈنر پر منتج ہوئی یہ ڈنر کریملن کے ایک بہت بڑے ہال میں رکھا گیا تھا۔ دو ہزار سے زیادہ مہمان جمع تھے۔ شمپین اور کیوی آر۔ قہقہے اور لباس فاخرہ۔ دنیا بھر کے دانشور ایک ہال میں جمع تھے۔ فیدن مرکزی میز پر کھڑے مہمان خصوصی کے نام سے پکار رہے تھے۔ کانگریس بخیر و خوبی سرانجام پا چکی تھی۔ اس لئے دل بالیدہ تھے اور ہونٹوں پر تبسم۔ فیدن نے سب سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کے نمایندوں کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مرکزی میز پر آنے کی دعوت دی۔ فیض۔ سلمیٰ اور میں، ایرینا اور مریم سلگانیک کو لئے وہاں چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں گہما گہمی اتنی بڑھ گئی کہ مرکزی اور دوسری میزوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہا۔ ادیب اور دانشور ایک میز سے دوسری میز پر آ جا رہے تھے۔ شمپین پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ زبانیں کھل گئی تھیں سلمیٰ اور ایرینا کو لوگوں نے گھیر لیا تھا اور ٹوسٹ پر ٹوسٹ پروپوز کئے جا رہے تھے، شاعرانہ انداز میں، مہکتے ہوئے جملوں میں، مختلف ملکوں کی شاعری جارجیائی شراب کی طرح اُمڈ آئی تھی۔

★

جُدائی کی گھڑی آپہنچی۔ دوسرے دن فیض کو دہلی آنا جانا تھا اور مجھے اور سلمیٰ کو آذربائیجان۔ ہم دونوں یوکرائینا ہوٹل کے وسیع وعریض لاؤنج میں ایک دوسرے سے اس شدت سے بغلگیر ہوئے اور اتنی دیر تک بغلگیر رہے کہ جب صدیوں کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے عرصے کے بعد ایک دوسرے سے بادلِ نخواستہ جدا ہوئے تو ہمارے اردگرد کوئی ساٹھ، ستر دوسرے ملکوں کے ادیبوں کا گروہ اکٹھا ہوچکا تھا اور گو میری اور فیض کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن ہمارے اردگرد ہر آنکھ پُرنم تھی۔ شاید اس وقت بہت سے ملکوں کے دانشوروں کو احساس ہوا تھا کہ گو ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوچکے ہیں لیکن اندر سے ہمارا جو اتنا پُرانا رشتہ تھا وہ کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ فیض نے اپنی جیب سے کاغذ کے دو پرزے نکال کے مجھے دیئے اور کہا "یہ میری دو نئی نظمیں ہیں۔ یہ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ایک سجّاد ظہیر کو دے دینا، دوسری سردار جعفری کو یہ دونوں نظمیں کہیں نہیں چھپی ہیں۔ پاکستان میں بھی نہیں۔ میں نے ماسکو میں کہی ہیں" پھر آخری بار زور سے مصافحہ کیا اور بڑے مضبوط لہجہ میں بولے "یہ جدائی عارضی ہے دوست۔ ہم پھر ملیں گے۔"

۱۹۷۱ء کی روسی ادیبوں کی پانچویں کانگریس میں فیض نہیں آئے۔ ہم نے ان کا بہت انتظار کیا۔ ایک تار بھی آیا کہ وہ آرہے ہیں۔ مگر فیض نہیں آئے۔ اس دن یوکرائینا کی آخری ملاقات کے بعد میں اُن سے کبھی نہیں ملا۔ مگر اب لگتا ہے کہ وہ جدائی عارضی تھی، ملن کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ کیونکہ گزشتہ چوبیس برس نفرت اور جنگ وجدل کے باوجود کوئی ایک تار ہے دلوں کے اندر جو نہیں ٹوٹا ہے اور ٹوٹ بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان میں محبت پھر اُبھرے گی۔ کوئی مانے نہ مانے مگر یہ وقت کا تقاضہ ہے۔ اس لئے لوحِ تقدیر ہے۔ •••

عبداللہ ملک

فیض کے بارے میں ایک گفتگو

زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرا ہاتھی سوا لاکھ کا سو حساب فیض جی کا ہو رہا ہے اب وہ سوا لاکھ کے ہو گئے ہیں ویسے فیض کے دوستوں اور چاہنے والوں کے لئے تو یہ خوشی کا مقام ہے کہ اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو رہا ہے لیکن فیض کے چاہنے والوں میں بھی قسم قسم کے لوگ تھے جیسے اس کے دشمنوں کی بھی متعدد قسمیں تھیں اور ہیں چنانچہ اب ایک یلغار ہے جس کی زد میں فیض کی ذات، اس کا کلام، اس کا فلسفۂ زیست، اس کا فلسفۂ جہد، اس کا سیاسی مسلک غرضیکہ اس کی زندگی کا ہر شعبہ آگیا ہے اور دوست اور دشمن اس کو اپنے اپنے مسالک، اپنے تعصبات، اپنی اپنی عینک سے اسے دیکھ رہے ہیں اور اسی رنگ میں عامۃ الناس کے سامنے پیش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں اس لئے آج ضروری ہو جاتا ہے کہ فیض کو اس کے اپنے کلام، اس کی نثر اور اس کے زندگی کی جدوجہد کے وسیع پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس کی شخصیت کو ایک حد تک جو گدلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ان کوششوں کو ناکام بنایا جائے کیونکہ ان کی شخصیت کو گدلانے کی کوششیں صرف دشمنوں کی صفوں سے ہی نہیں ہو رہی ہیں بلکہ ان کے جاہل دوست جو ان کی شخصیت اور ان سے تعلقات کے حوالے سے اپنا قد بھی بڑھانے کی کوشش میں ہزار داستانیں وضع کر رہے ہیں۔ اس لئے ابھی سے چھان پھٹک کا عمل بھی ساتھ جاری رہنا چاہیئے۔

پچھلے دنوں لاہور میں فیض کے حوالے سے دو محفلیں بپا ہوئیں ایک سرکاری نہج کی تھی جس کا اہتمام پاکستان آرٹ کونسل کے ڈائریکٹر جنرل خالد سعید بٹ نے کیا تھا اور اس کی صدارت وزیر سیاحت اور کلچر ارباب نیاز محمد نے کی تھی۔ اس میں سب سے اہم تقریر

پروفیسر کرار حسین نے کی تھی جنہوں نے فیض کو ایک نظریے اور اپنے وطن کی مخصوص مٹی اور اس کی مختلف ثقافتوں کی آمیزش کا شاعر قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ کمیونزم کے نظریے نے تو فیض پیدا کر دیا۔ اب خدا کرے اسلام کو نظریہ بنا کر پیش کرنے والے بھی اپنے اندر سے ایک دو فیض پیدا کر سکیں۔ پروفیسر کرار حسین نے اس امر پر اصرار کیا تھا کہ ان کے نزدیک اسلام دین حق ہے نہ کہ نظریہ۔ کیونکہ نظریہ زمانے سے متعلق ہوتا ہے اور دین دائمی ہوتا ہے۔ پروفیسر کرار حسین کی باتوں پر جو تائید اور تحسین کی تالیاں پٹیں۔ اس سے محکمہ سیاحت کے مرکزی سیکرٹری کچھ غصے میں آگئے اور انہوں نے ان باتوں کی تردید کرنے کی کوشش کی اس پر حاضرین محفل اپنی ناپسندیدگی کے اظہار میں اٹھ کر جانا شروع ہو گئے اور اس محفل کا آخری جملہ قدرت اللہ شہاب کا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ میرے جیسے ٹکے ٹکے کے بیوروکریٹ تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن فیض جیسے نابغہ روزگار صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

اس محفل کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک ہی محفل میں فیض کو کس طرح متنازعہ بنایا گیا۔ ایک طرف پروفیسر کرار حسین تھے دوسری طرف سرکار کی وقتی ضرورتوں کا احساس جان کو کھائے جا رہا تھا اور اس طرح ایک سجی سجائی محفل کو غارت کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

ایک محفل اور منعقد ہوئی۔ یہ محفل روزنامہ جنگ والوں نے اپنے فورم کے تحت منعقد کی، اس محفل کے دولہا میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ تھے۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے تقریباً دو گھنٹے تک فیض کے بارے میں اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا انہوں نے اس بیسویں صدی کے آخری نصف میں تخلیق کی جانے والی عالمی شاعری کے کینوس میں فیض کو پرکھنے کی کوشش کی۔

میاں دولتانہ کو عام لوگ ایک سیاسی قائد کے حوالے سے ہی جانتے ہیں کم لوگوں کو یہ علم ہے کہ میاں دولتانہ ادب، شاعری، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کے بے حد شائق ہیں اور ان کے بارے میں وہ مسلسل پڑھتے رہتے ہیں چنانچہ اس محفل میں انہوں نے یہ بتایا کہ وہ انگریزی، اردو، پنجابی ہی نہیں بلکہ فرانسیسی اطالوی اور ہسپانوی زبانیں بھی جانتے ہیں اور ان زبانوں میں پیدا ہونے والی شاعری بھی وہ پڑھتے رہتے ہیں اس لئے وہ بغیر کسی مبالغے کے یہ تقابل کر سکتے ہیں کہ فیض کی شاعری ان تمام زبانوں میں تخلیق کی جانے والی شاعری

سے زیادہ ارفع و اعلیٰ تھی، انہوں نے فیض کی وطن دوستی اور حب الوطنی کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ فیض سے بڑھ کر کوئی اور محب وطن ان کی نگاہوں میں نہیں ہے، انہوں نے آخر میں فیض کی مسلمانی کا بھی ذکر کیا اس کے بعد سوالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس محفل میں آئی اے رحمٰن نے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ سے سوال کیا میاں صاحب آپ نے فیض کے کلام کے بارے اتنا عالمانہ لیکچر دیا ہے۔

لیکن آپ نے فیض کے سیاسی مسلک کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا؟

اس پر میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے کچھ توقف اور ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا کہ فیض مارکسسٹ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے عالمانہ طریقے سے یہ بھی وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح مارکسزم میں بھی کئی تبدیلیاں آگئی ہیں ان کا مقصد یہ محسوس ہوتا تھا کہ فیض کو مارکسسٹ تسلیم کرنے کے باوجود اس کے مارکسزم کی اہمیت کو قدرے گھٹا دیا جائے۔

اسی طرح سے عبدالقادر حسن نے کہا کہ میاں صاحب کیا فیض کی شاعری تمام دنیا کے انسانوں کے لئے نہ تھی اور وہ بڑھ کر انسان پر کہیں بھی ظلم ہوتا ہو وہ اس کو اپنے متعلق ہی محسوس کرے گا میاں صاحب نے اس کو تسلیم کیا۔ مقصد یہ محسوس ہوتا تھا کہ فیض کی شاعری کو کسی بھی کھاتے میں ڈال دو مارکسزم کے کھاتے میں نہ ڈالو! کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مارکسسٹ اور دولت دو متضاد خانے ہیں اس لئے فیض کو انسان دوست مان لیا جائے لیکن مارکسسٹ نہ مانا جائے حالانکہ مارکسزم کا پورا ڈھانچہ ہی انسان دوستی پر تعمیر ہوتا ہے مختلف محفلوں کا میں نے ذکر ہی اس لئے کیا ہے تاکہ میں فیض کی شاعری اور اس کی زندگی کی جدوجہد پر مارکسزم کی چھاپ کا تعین کر سکوں کیونکہ میرے نزدیک فیض کی عظمت کا راز مارکسزم پر اس کو جو عبور اور ادراک حاصل تھا اس میں پوشیدہ ہے دراصل فیض نے مارکس کے فلسفہ جہد کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا تھا وہ اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا تھا، دراصل ہمارے ہاں چونکہ مارکسزم کو صرف ایک نعرہ سمجھا جاتا یا جدال و قتال کا فلسفہ تصور کیا جاتا ہے اور آج چونکہ دلیس دلیس میں بالخصوص تیسری دنیا میں کے اکثر ممالک میں عامتہ الناس مارکسزم کے پرچم تلے اپنے لوگوں کی آزادی اور خوشحالی کے لئے مصروف پیکار ہیں اور یہ معرکہ تلوار بدست بھی ہو رہا ہے اور مظاہروں، جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کی شکل میں بھی کھیلا جا رہا ہے اس لئے

ایسے میں جب مارکسزم عمل جدوجہد گوریلا طریق جنگ سے کلیتہً منسوب ہو گیا ہو تو ہمارے ہاں کا دانشور اور پڑھا لکھا حیران ہو کر کہتا ہے کہ فیض جیسا کم گو "شرمیلا" "شریف النفس" کیسے مارکسسٹ ہو سکتا ہے، دراصل مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں چونکہ سیاسی عمل بالکل زیر زمین چلا گیا ہے اور بظاہر ایک قبر سا سکوت چھا گیا ہے تو ایسے میں صرف فیض کی آواز اور شاعری ہی تھی جو اس خاموشی، اس سکوت اور اس یاس و ناامیدی کا پردہ چاک کر رہی تھی اور وہ بہت ہولے ہولے، آہستہ خرامی سے تو ایسی آواز اور شاعری کے خالق کو ہم مارکسسٹ ماننے سے گریزاں تھے کیونکہ ہم نے مارکسزم کو گھن گرج، جدال و قتال اور گوریلا طریق جنگ سے ہم آہنگ کر رکھا تھا اور فیض چونکہ ان پر پورا نہیں اترتا تھا اس لئے ہم اس کو مارکسسٹ ہی تسلیم نہیں کرتے تھے، یہ ہم فراموش کر دیتے ہیں کہ مارکسزم ایک فلسفہ زلیست ہے، دینا اور کائنات کو ملنے، اس کے ارتقاء اور تبدیلیوں کے ضابطوں اور قوانین پر عبور حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے لیکن ہم اس مارکسزم کو جو فلسفہ زلیست ہے کہ ماننے سے انکار کرتے ہیں یا ماننا ہی نہیں چاہتے اس لئے فیض کو بھی اسی کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں کہ فیض جیسا شریف النفس انسان بھلا کیسے مارکسی ہو سکتا ہے لہٰذا ہم فیض کو مارکسی فلسفے کا حامی اور جدید تسلیم کرنے سے ہچکچاتے اور گریز کرتے ہیں اور میاں ممتاز محمد دولتانہ جیسے سیاسی قائد کے لئے تو اور بھی یہ بات لرزا دیتی ہے کہ یار لوگ کیا کہیں گے کہ یہ مارکسسٹ فیض کی تعریف میں رطب اللسان ہے کہیں یہ خود بھی تو مارکسسٹ تو نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ میاں ممتاز دولتانہ کی تمام عمر اسی الجھن، اسی ادھیڑبن اور اسی خوف میں کٹی ہے کہ لوگ اسے کہیں مارکسسٹ اور کمیونسٹ نہ کہہ دیں، اسی لئے انہوں نے اپنی سیاست کے دور شباب میں اپنے ایسے دوستوں سے منہ بھی موڑا اور دائیں بازو سے یارانہ گانٹھنے کے لئے کون سا پاپڑ تھا جو انہوں نے نہیں بیلا لیکن بالآخر ان کے اندر کا ترقی پسند ان کو حلقہ فیض میں کشاں کشاں لے آیا اور اماں ملی، سکوں ملا، تو کہاں ملا، اس لئے ضروری اور لازم ہے کہ ہم اب فیض کے بارے میں کھل کر بات کریں یہ بات شروع میں ہی ہمیں تسلیم کر لینی چاہئے کہ فیض بنیادی طور پر شاعر تھا وہ انسانی ثقافت اور تہذیب کا طالب علم تھا تمام عمر اس نے مارکس کی تعلیمات کی روشنی میں ان موضوعات پر کام کیا ہے لیکن وہ مارکسی قائد نہ تھا لیکن

چونکہ ایسے ملک میں اس نے شاعری کی، صحافت کی، فنونِ لطیفہ کے بارے میں کام کیا
ٹریڈ یونین میں بھی کام کیا جہاں بالعموم سیاسی عمل پر قدغن اور پابندیاں رہی ہیں اس لئے
یار لوگوں نے فیض سے ہمیشہ سیاسی قیادت کی توقعات وابستہ کر لیں اور ان کو ایک
کمیونسٹ قائد کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی جو مختلف ادوار میں بائیں بازو کی رہنمائی کرے
ان کے لئے سیاسی داؤ پیچ اور طریق کار کا تعین کرے، یہ تمام باتیں اس کے بس کی نہ تھیں
اب کسی نے پبلو مرودا سے سیاسی رہنمائی کی توقع نہ کی تھی، نہ ہی ناظم حکمت سے یہ توقع
باندھی گئی تھی، اس لئے فیض کو اس کے دائرہ کار میں پرکھنا چاہیئے، اس میدان میں
اس نے کھل کر اپنی سماجی تبدیلیوں کی نشاندھی کی ہے ہاں اب فیض کے مارکسزم کا جہاں
کتابی علم حاصل کیا وہاں بنیادی طور پر اس کو مارکسزم کے فلسفے کی طرف کشاکش روزگار
نے بھی مائل کیا اور اسے اپنے چاروں طرف جو زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں
اس نے بہت بری طرح متاثر کیا تھا اور یہ زمانہ تھا اس کی شاعری کی ابتداء کا یہ زمانہ
تھا جب یہ کرہ ارض ۱۹۲۹ء کے زبردست اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آرہا تھا جب
سرمایہ دار دنیا اور اس کے غلام ممالک میں بے روزگاری اور افراطِ زر اپنے عروج پر
تھیں اور اسی دور کے متعلق فیض خود لکھتا ہے۔

شعر گوئی کا واحد عذرِ گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گرد و پیش میں
میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے یہ نقش فریادی
کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں ۲۹-۲۸ء سے ۳۵-۳۴ء تک کی تحریریں شامل
ہیں جو ہماری طالب العلمی کے دن تھے یوں تو ان سب اشعار کا تقریب قریب ایک ہی
ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ
ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی
ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی
مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ ۲۰ء سے ۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے
کچھ عجب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا۔ جس میں اہم قومی اور سیاسی
تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں
منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اوّلاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور

اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی، افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔ نقشِ فریادی کی ابتدائی نظمیں "خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو، میری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو"، "تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں"، وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیرِ اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبتِ یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک چھاننے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی۔ اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ سوزِ محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس کیفیت کا اختتام جو نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے۔ جسے میں نے یاس کا نام دیا تھا۔ وہ یوں ہے:-

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے

چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم

زحمتِ گریہ و بکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول

بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد تیرہ چودہ برس "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں" میں گزرے اور پھر فوج صحافت ٹریڈ یونین وغیرہ میں گزارنے کے بعد ہم چار برس کے لئے جیل خانے چلے گئے یہ میں نے طویل اقتباسات فیض کے اپنے قلم سے اس لئے دیا ہے کہ آج فیض کو جو اس کے دشمن ہائی جیک کرکے اپنے کھاتے میں ڈالنا چاہتے ہیں ان کا منہ بند کیا جا سکے گو مجھے معلوم ہے کہ یہ عمل بہت دنوں جاری رہے گا۔ کیونکہ آج رجعت پسند اتنے بانجھ ہو گئے ہیں کہ اب ان کے ہاں نہ کوئی شاعر پیدا ہو سکتا ہے نہ مفکر جس کے ذریعے وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں اس لئے آج وہ فیض کو "انسان دوست" "شریف النفس" اور "مومن" بنا کر پیش کرنے پر مجبور ہیں ان کا مقصد ہی دراصل یہ ہے کہ فیض کی انقلاب دوستی، اس کی مارکسی انسان

بجھ گئی شمع آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل

انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۳۵ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کرلی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہمعصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقا صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ اس میں بہر حال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں اس نئے احساس کی ابتدا نقشِ فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے اس نظم کا عنوان ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ خاتون ہیں تو "مرے محبوب نہ مانگ"

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے

دوستی کے ڈنک کو نکال کر اسے صرف ایک مرنجان مرنج انسان بنا کر پیش کر دیا جائے لیکن غالباً فیض اتنا سخت جان ثابت ہو گا جہاں قائد اعظم اور اقبال ان "جہلا" کی یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکے وہاں فیض محفوظ رہ جائے گا ورنہ اب تک فیض کے "اقوال" بھی ٹیلی ویژن پر آنے شروع ہو جاتے۔

دراصل فیض کا یہی وہ دور ہے جب وہ مارکسزم کی طرف مائل ہوا اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس دور کی تفصیلات کو اگر یکجا کیا جائے تو نئی نسل کو معلوم ہو گا کہ یہ کتنا ہنگامہ خیز دور تھا جس نے پورے برصغیر میں زبردست ہلچل پیدا کی اور یہی وہ دور تھا جب دوسرا کمیونسٹ سازش کیس میرٹھ میں قائم ہوا جس میں پورے برصغیر کے چوٹی کے کمیونسٹ پابند سلاسل کئے گئے یہی وہ دور تھا جب پہلی بار اشتراکی روس کا پہلا پنجسالہ منصوبہ کامیاب و کامران ہوا۔ اور بے روزگاری کا عملاً خاتمہ ہوا اور اس کے مقابلے میں سرمایہ دار دنیا شدید اقتصادی بحران کا شکار ہوئی۔ اسی ہنگامہ خیزیوں نے ہندوستان کے برصغیر میں ہر زبان میں ادب کی نئی تحریکوں اور نئے رجحانات کو جنم دیا اور فیض انقلابی تحریک کا منتہائے کمال ہے نصف صدی میں جس کی آبیاری ہوئی تھی اور آج ایک عالم اس انقلابی تحریک کے سائے میں زندگی گذار رہا ہے زندگی گذارنے کے لئے مصروف پیکار ہے۔

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیںگے

اشفاق احمد

خوش منزل لوگ

فیض صاحب کی بات کرتے ہوئے یا اُن کا ذکر سنتے وقت یا ان کی اپنی باتیں پڑھتے وقت اس حقیقت کا اعتراف ضرور کرنا پڑتا ہے کہ فیض کا انجام بخیر ہوا اور ان کی عاقبت بہتر طے پا گئی اور وہ انعام یافتہ لوگوں کی صف میں شامل ہو گئے ۔ حالانکہ حیران کن بات یہ ہے کہ فیصلے تو بعد میں ہوتے ہیں اور حساب کتاب کے لئے تو روزِ جزا کا دِن مقرر ہے اور اس کے لئے تو ابھی بڑی طویل مدت پڑی ہے ـــــــ لیکن ! انسانوں کی دنیا میں کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی عاقبت کے بارے میں لوگ پہلے ہی سے فیصلہ کر دیتے ہیں کہ اپنے مالک کی نگاہ میں یہ شخص مقبول ہوا اور اس کی عاقبت بہتر قرار دی گئی اور یہ خاصوں میں سے ٹھہرا ۔ اس میں ایک آدھ ڈگری کی اونچ نیچ ہو سکتی ہے لیکن کیٹگری میں فرق نہیں ہوتا ۔

جن کی عاقبت کے بارے میں لوگوں نے ابھی سے فیصلہ دے دیا ان میں بلند ترین مقام ان عابدوں کا ہوتا ہے جن کی کائنات خدا شناسی سے لے کر مخلوق شناسی تک پھیلی ہوتی ہے اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن سے مخلوق خدا کسی وجہ سے خوش ہو جاتی ہے ۔ خوش رہتی ہے اور پھر ان کی موجودگی اور ناموجودگی میں خوش ہی رہتی ہے ۔ ایسے لوگوں کی عاقبت زمین پر ہی طے ہو جاتی ہے اور متفقہ طور پر طے ہوتی ہے ۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور لوگ متفقہ طور پر ایسا کیوں سمجھنے لگتے ہیں اس کا بھید مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا بس یہ ایک راز ہے جو ازل سے اسی طرح سے چلتا آیا ہے اور روزِ حساب تک اسی طرح سے چلتا جائے گا۔
فیض کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ وہ ایک عظیم شاعر تھا اور اس کی شاعری نے لوگوں

کے دل موہ لئے تھے اور اس نے غزل کی روایت کو جدید ستمبل عطا کئے تھے اور اس نے فارسی ترکیبوں کو بڑے سجاؤ کے ساتھ استعمال کیا تھا اور وہ عربی زبان کی باریکیوں سے خوب آشنا تھا تو یہ فیض کو ایک تنگنائے میں محدود کرنا ہوا ۔ کیونکہ یہ بات بلکہ ساری باتیں تو اور شاعروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہیں بلکہ ان شاعروں کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر کہی جا سکتی ہیں مگر وہ ان ساری خوبیوں اور اپنی ان جملہ صلاحیتوں کے باوجود فیض نہ بن سکے اور اس مقام کے قریب بھی نہ پہنچ سکے جہاں سے فیض نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا ۔

پھر فیض کو ایک بہت ہی پیارا ، منکسر من موھنا ، خوش ادا ، متحمل اور صاحب برداشت شخص گردان کے اس کی سوبھا کرنا اور اس کی عظمت کو محض اس کی برداشت کے ساتھ وابستہ کرنا بھی کوئی وزنی دلیل نہیں ۔ فیض کے اپنے شہر بلکہ اُس کے اپنے گاؤں میں بے شمار لوگ اس کے مزاج اور اس کی طبیعت اور اس جیسی برداشت کے تھے ۔ اس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں لیکن وہ فیض نہ ہو سکے نہ کبھی ہو سکیں گے ۔۔۔
یا پھر یہ سمجھنا کہ وہ بہت کمال کے ایڈیٹوریل رائٹر تھے اس لئے صاحبِ کمال تھے ۔ تو میں اسے فیض کی توہین سمجھوں گا کیونکہ ان جیسے بلکہ ان سے بہتر سینکڑوں ہزاروں ایڈیٹوریل رائٹر اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن ہم ان کو فیض جیسا مان نہیں دیتے ۔ نہ ہی وہ اس کے مستحق ہیں ۔

یا پھر یہ کہنا کہ فیض چونکہ ایک انقلابی تھے اور غریبوں اور کسمپرسوں کے شاعر تھے اس لئے ایک بہت بڑے شاعر تھے اور لوگ اس وجہ سے ان سے محبت کرتے تھے کہ وہ محروموں کے ترجمان اور بے نواؤں کی نوا تھے تو یہ بات بھی نہیں ہے ۔ ان سے بہت بڑے سوشلسٹ اور ان سے بہت زیادہ نامی گرامی انقلابی بھی اس صدی میں ان کے اردگرد سے ہو گزرے لیکن ان کو فیض کا رُتبہ نہ مِل سکا ۔

آپ فیض کی شاعری کا یا فیض کی شخصیت کا جتنا بھی تجزیہ کریں گے اور اپنی دانش کے زور پر اس کے فن کی جتنی بھی جزئیات بیان کریں گے وہ فیض کے فیض ہونے کی وجہ نہیں ہوں گی کیونکہ فیض کوئی عام انسان یا معمولی چیز نہیں ہے اور خاص کو بلکہ خاص الخاص کو عام پیمانوں سے اور چالو معیاروں سے جانچا نہیں کرتے ۔

اصل میں بات یہ ہے کہ جب کسی خاص معاشرے میں کسی خاص وقت کے اندر کچھ خاص تقاضوں کے تحت فیض جیسی توجہ طلب شخصیت اور فیض جیسا شہیر انسان مر جائے اور لوگ اس کو ایک فنومنن سمجھنے لگیں تو پھر فیض کا تجزیہ چھوڑ کر خالق فیض کا مطالعہ کرنا چاہئے جو کچھ سے کچھ اور کیا سے کیا اور کس کو کون بنا دیتا ہے اور پھر اس کون کو بغیر کسی محنت یا کوشش کے لوگوں کے دلوں پر حکمراں بنا دیتا ہے۔ اور دلوں کے سنگھاسن پر بیٹھنے والے کو خوب عطا کرتا ہے اور بغیر حساب عطا کرتا ہے۔ اور پھر جس کو وہ عزت عطا فرما دیتا ہے تو اس کے خلاف سینکڑوں ایڈیٹوریل۔ ہزاروں ایڈیٹوریل نوٹس۔ لاتعداد کالم۔ بے شمار تقریریں۔ چھوٹے بڑے بھونپو۔ پٹاخے۔ جلسہ ٹلیاں اور سٹیج پٹخیاں اس کی عزت کے خزانوں میں سے ایک رائی کے دانے کے برابر کمی نہیں کر سکتیں۔

جس نے ابھی سے فیض کی عاقبت اچھی کر دی اور جس کی اچھی عاقبت کے لئے لوگوں کی محبت اور عقیدت کی نشانی فراہم کر دی گئی تو ہم ایسے کم مایہ لوگ اس کی شخصیت پر کیا روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ اسے ایک فن کار سمجھ کر اس کے فن کے حواس خمسہ بیان کر سکتے ہیں یا اس کو ایک اچھا انسان ایک اچھا دوست ایک اچھا باپ یا ایک اچھا کامریڈ کہہ کر اپنی ذمہ داری کا بوجھ اچھالی کے کندھے پر ڈال کر سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ ہلکے پھلکے محسوس کر سکتے ہیں —— لیکن فیض کوئی معمولی چیز تو نہیں یہ تو عطائے ربانی کا ایک جیتا جاگتا منظہر ہے۔ ایسے شخص کے سامنے خاموش اور ایسے شخص کے ساتھ مودب ہو جانا چاہئے۔ کچھ اس کی اپنی وجہ سے نہیں بلکہ اس عطائے خاص کی وجہ سے جو اس کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ اس وقت فیض کی شاعری، اس کی شخصیت یا اس کی انسان دوستی کا تجزیہ کرنے کی کم از کم میری کوئی خواہش نہیں۔ میری آرزو تو اب اچھی عاقبت والوں کی اردل میں چلنے کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ فیض بھی اس عہد کی اچھی عاقبت پانے والوں میں سے ایک ہیں۔
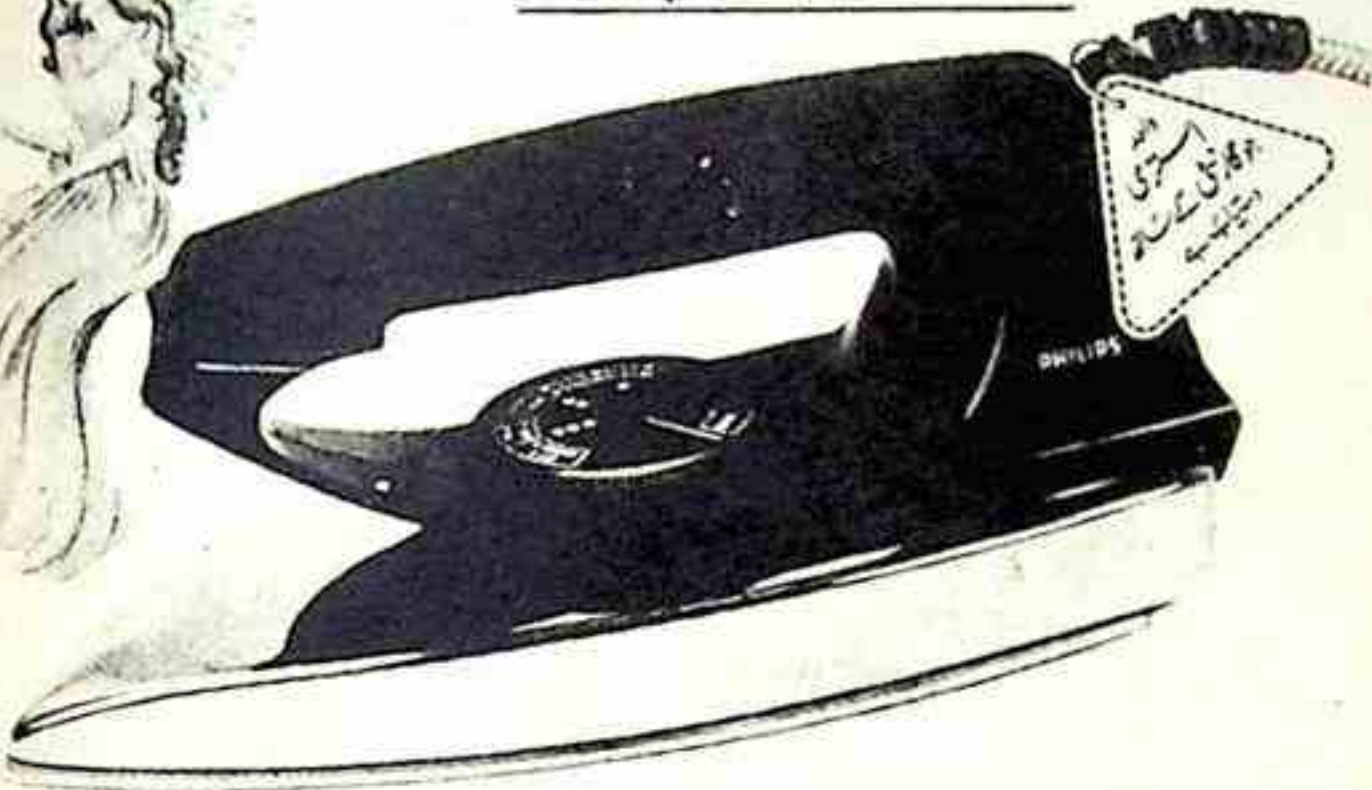
فلپس کی جدید کم وزن استری جو آپ کی محنت، وقت اور بجلی کے خرچ کی بچت کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ قابلِ اعتماد نمونہ ہے سالہا سال چلتی ہے۔

سہولت ہی سہولت

- اعلیٰ درجہ کا حرارت بخش ایلی منٹ جس کی بنا پر استری فوراً مقررہ حد تک گرم ہو جاتی ہے۔
- ہلکی اور کم وزن۔ تھکاتی نہیں۔
- وقت اور محنت بچاتی ہے۔
- دیرپا کارکردگی کی ضمانت

فلپس کی گارنٹی شدہ استری خریدیئے۔
بجلی کا خرچ، محنت اور وقت بچایئے۔

فلپس

ڈسٹری بیوٹرز: یونائیٹڈ ڈسٹری بیوٹرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کراچی	۲۲۱۳۱۷	ملتان	۳۹۴۳
لاہور	۵۵۲۹۴	فیصل آباد	۴۲۲۸۳
راولپنڈی	۹۲۲۳۷	حیدرآباد	۲۶۹۳۱
پشاور	۷۲۵۱۶	سکھر	۸۲۸۷۳

ASIATIC

تجمل حسین

فیض صاحب کی باتیں اور یادیں

زندگی میں پہلی دفعہ لاہور آنا پڑا لگا۔ اب یہاں صوفی تبسم صاحب کا گھر نہیں ہے فیض نہیں ہیں، استاد دامن نہیں ہیں، یہ سب لوگ اپنا مکان بدل چکے ہیں اور دنیا اپنے بھی چھوڑ کر نہیں گئے۔

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

گذشتہ اکتوبر میں فیض تین روز کے لیے کراچی تشریف لائے اور دوبارہ طویل قیام کے لیے آنے کا وعدہ کر کے لاہور واپس آ گئے۔ ان تین دنوں میں ان کے دم قدم سے کیسی کیسی خوبصورت محفل سجی لیکن کسے معلوم تھا کہ چند دن بعد میر محفل کے لیے ایسی محفلوں کا اہتمام ہوگا۔ جہاں انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں گی اور ہر شخص صوفی صاحب کے اس مصرعے کی تصویر بنا ہوگا۔

ع جس سمت نظر اٹھی آواز تیری آئی

لیکن یہ دکھ تو ہمارا ذاتی دکھ ہے۔ ان لوگوں کا جن کی زندگی فیض کے بغیر ویران ہو گئی ہے ـــــ وہ خود تو زندہ وجاوید ہیں۔ انہوں نے اپنی ابدی زندگی کا اہتمام، بڑی محبت، بڑی لگن اور بڑے دکھ سہہ کر کیا ہے ـــــ یہ ان کا حق ہے جو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا میری نیاز مندی فیض صاحب سے چالیس برس سے اوپر کا قصہ ہے۔ اس عرصے میں، میں نے انہیں بہت قریب سے بڑے بڑے طوفانوں سے بے نیازی سے گذرتے ہوئے دیکھا ہے، مگر کبھی شکایت کرتے ہوئے یا غم دنیا کا روایتی انداز میں اظہار کرتے ہوئے نہیں

دیکھا۔ وہ اپنے سارے غم کچھ شعروں میں ڈھال دیتے اور کچھ مسکراہٹوں سے ٹال دیتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تعزیت کی محفل میں بھی لوگوں کو اور اپنے دوستوں کو رُلانے کی بجائے ہنسانے کی کوشش کو ہی پسند کریں گے اور اسی لیے میں اپنے غم کو ان کی ہنستی مسکراتی ہوئی بہت سی یادوں میں ڈبونے کی کوشش کرتا ہوں۔

فیض کو پہلی بار ۱۹۴۰ء میں، میں نے ان کے اور اپنے کالج۔ گورنمنٹ کالج لاء کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔۔۔۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ان کا کیمبرج جانا جنگ کی وجہ سے رک چکا تھا اور وہ ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی پڑھاتے تھے۔۔۔ یہ زمانہ مشاعروں کا زمانہ تھا، لاہور کے اس دور کا مشاعروں اور مشاعروں میں ھوٹنگ بازی کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، ترقی پسند اور فن برائے فن کے پیرو ایک دوسرے سے تقریباً دست گریباں تھے۔ فیض نے نظم شروع کی تو ہر مصرعے پر داد و تحسین کے ڈونگرے برس رہے تھے جب انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا

ع جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

تو اختر شیرانی، جن کا اس وقت بھی بڑا نام تھا، نے دھت آواز میں کہا۔

فیض ــــ بکتے ہوئے نہیں بکتے ہوئے جسم کہو ــــ محفل میں قہقہوں کا کہرام ذرا تھما تو فیض نے دھیمی آواز میں کہا، حضور آپ کا مصرع تو بجائے خود ایک نظم ہے بلکہ ایک نظام ہے اور میرا چھوٹا سا مصرع اس رعونت کے خلاف احتجاج ہے اور فیض نے مشاعرہ لوٹ لیا، اور ان سے میری نیازمندی کا آغاز ہوا۔

ان کے چھوٹے بھائی چودھری عنایت جو بعد میں کرنل سی، آئی، احمد بنے، ہمارے ہمسائے میں رہتے تھے۔ جن کی عنایت سے فیض صاحب کا فیض ہمیں نصیب ہوا مگر اس زمانے میں طلاپ اتنا ہی تھا کہ ہاں برخوردار کیا حال ہے فلاں کتاب دیکھی یا نہیں؟ــــ تقریر اچھی کرتے ہو، پر ضامت چھوڑنا اور پھر وہ دہلی چلے گئے ــــ جب لاہور واپس آئے تو ہم طالب علم سے تقریباً وکیل بن چکے تھے۔ صوفی صاحب سے شاگرد اور استاد کے رشتے میں دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا اور ہم فیض صاحب کی تقریباً تمام عبارات کو اپنا چکے تھے سوائے اچھا شعر کہنے کے، یہ وہ وقت ہے جب فیض، مولانا چراغ حسن حسرت اور سید سبط حسن صحافت کے ایک نئے دور کا آغاز کر رہے تھے۔

پھر ان محفلوں کا آغاز ہوا جو ہمارے استاد صوفی تبسم صاحب کے گھر ہر شام بلا ناغہ برپا ہوتی تھیں اور صوفی صاحب کی زندگی تک جاری رہیں، ان محفلوں کی رونق بخاری صاحب فیض، تاثیر، حسرت، حفیظ ہوتے تھے اور ہم جیسے لوگوں کو بھی برداشت کیا جاتا تھا۔ ہم وہاں سے ہر شام ڈھیروں علم کی دولت لوٹ کر لے آئے ـــــ یہ ہماری نالائقی ہے کہ ہم اس لوٹ سے استفادہ نہ کر سکے۔ ان محفلوں میں جو شخص برجستہ فقرہ بولنے کے فن سے محروم ہوتا۔ بہت جلد ذلیل و خوار ہو کر نکل جاتا ـــ میں سمجھتا ہوں کہ فیض کے اچھوتا اور برجستہ فقرہ بولنے کے فن کی تعمیر اور جلا میں ان محفلوں کا بڑا دخل ہے۔

ایک دن کہنے لگے کہ صوفی صاحب اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری تعلیم مکمل کرنے کے لیے بادشاہی مسجد کے گرد و نواح سے متعارف کر دیا جائے۔ میں نے چلنے کو کہا تو کہنے لگے اس علاقے میں دوپہر کو جانے والے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ـ شرفا، وہاں سورج ڈھلے جاتے ہیں کچھ دنوں کی بات ہے کہ عبداللہ ملک اور میں فیض صاحب کی خاموش گفتگو سُن رہے تھے کہ حکومت پاکستان کے ایک بہت بڑے آدمی تشریف لائے اور پوچھنے لگے۔ فیض صاحب آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے، فیض صاحب ان کے اتالیق رہ چکے تھے کہنے لگے، بھائی سب سے بڑا کارنامہ تو یہی ہے کہ تمہیں بی۔ اے پاس کروا دیا وفات سے چند ہفتے پہلے، بچوں کو ملنے گھر تشریف لائے، میری بیوی نے کہا کہ کوئی شخص بھی صحیح جواب نہیں دیتا، یہ یزید اور شمر وغیرہ کی اولاد کا کیا ہوا اور وہ لوگ اب یہاں ہیں ـ کہنے لگے بی بی دیکھو یہ کچھ مسلمانوں کا گھپلہ ہے ـ ہم تو چند پشت پہلے کفار میں سے تھے کبھی سید سبط حسن سے دریافت کرنا،

لندن میں ایک شاعر۔معروف شاعر، اپنی نظمیں سنا رہے تھے ان نظموں میں لفظ "بُو" کا بے دریغ استعمال تھا، سنا چکے تو پوچھا حضور کیسی ہیں، فیض نے کہا اور تو سب ٹھیک ہے ذرا "بُو" کم کرو، اور بہت سی ایسی یادیں ہیں جنہیں میں انشاء اللہ ضرور محفوظ کروں گا۔ یہ مجھ پر ان کا قرض ہے ـ اس وقت تو میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فیض بے پناہ انسان تھے۔ جنہیں دنیا بھر کی خوشیوں اور غموں کو بیک وقت اپنے دامن میں سمیٹنے کا سلیقہ آتا تھا وہ سلطان باہو کے ان ابیات کا جیتا جاگتا مرقع تھے۔

جیوندیاں مر رہنا ہووے تاں ویس فقیراں کریئے ھُو
جے کوئی سٹے گدڑ کوڑا وانگ اروڑی سہیئے ھُو

جے کوئی گڈھے گا ہلیاں، مہناں، اوس نوں جی جی کہیے ہو
گلہ، الاہماں، بھنڈی، خواری، یار دے پاروں سہیے ہو

یہ تو ٹھیک ہے مگر جب میں یہ کہتا ہوں کہ وہ بے پناہ انسان تھے تو میں انہیں کسی مافوق الفطرت قسم کی چیز کے نقش و نگار نہیں دینا چاہتا، وہ دھیمے آدمی تھے انہیں لوگوں سے بہت محبت تھی، اور وہ سچ کہتے۔

کہ سہل یوں راہ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے

مگر وہ اپنے سے لڑتے بھی تھے، باز پرس بھی کرتے تھے، ان کے لیے روتے بھی تھے، ان کی خوشیوں میں بھی شامل ہوتے تھے۔

یہ سن پینسٹھ کا واقعہ ہے وہ لاہور تشریف لائے اور میرے پاس ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو کراچی واپس چلے گئے۔ — میں نے اس واقعہ کا ذکر کسی محفل میں کیا، اور اس انداز میں جو مجھے زیب نہیں دیتا تھا، — لاہور کے ایک اخبار نے اُسے نمایاں طور پر چھاپا، فیض صاحب کا خط آیا۔

تجمل

ایک دوست نے اخبار کا یہ تراشا بھیجا ہے، — اسے غور سے پڑھو۔ جوشِ خطابت میں لوگ اکثر بہک جاتے ہیں۔
ہم نے بزرگوں سے سُن رکھا ہے کہ بہن سے مذاق جولاہے کیا کرتے ہیں۔
نسیم اور بچوں کو پیار، اللہ انہیں تمہاری زبان درازی سے محفوظ رکھے۔

مخلص فیض

اس واقعہ کے فوراً بعد میرا تبادلہ کراچی ہوگیا۔ جہاں وہ اس وقت سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل تھے اور پھر تقریباً ساڑھے برس ہر شام ان کے شعروں کی سرشاری میں، بخاری صاحب کے جملوں میں اور ایلس کی ڈانٹ ڈپٹ میں لت پت گذرے مگر اس واقع نے محبت میں کوئی بال نہ آنے دیا، بڑے نے چھوٹے کو ڈانٹ دیا اور بات ختم۔

دل گداز اتنا کہ لندن میں ایک پوری رات، صوفی صاحب کی وفات کے

بعد ان کی باتیں کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گذار دی ۔ شگفتہ طبیعت ایسی کہ تحریر پڑھ کر طبیعت باغ و بہار ہو جائے ، میرے پاس انکا آخری ۱۸ جنوری کا ہے

بیروت ۱۸ جنوری بجمل سلام - دعا -

عزیزی عمران کی خانہ آبادی کا دعوت نامہ ملا ۔ تم دونوں کو تہنیت - اور دولہا ۔ دلہن کو دعائے عمر درازی ۔

اور اب جو تم سُسر بن گئے ہو تو گورنمنٹ کالج کے مولوی کریم بخش مرحوم ۔ (جو عربی پڑھاتے تھے) کی ایک بات یاد آئی ، جب ہم گورنمنٹ کالج میں تھے تو مولوی صاحب مرحوم کو ان کی مرضی کے خلاف ، دیوان غالب پڑھانے پر معمور کر دیا گیا مولوی صاحب ہر دوسرے ، چوتھے شعر پر فرماتے کہ ہٹاؤ بے حیائی کا شعر ہے آگے پڑھو ایک دن ہم اس شعر پر پہنچے ۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

مولوی صاحب نے پھر وہی جملہ دہرایا ، ہم نے کہا چند کی شرح کیجئے ۔ مولوی صاحب بولے ، بھائی شاعر کہتا ہے کہ بچپن میں جو تم نے جھک ماری سو ماری - اب تو منہ پر داڑھی آگئی ہے ۔ اب تو شرم کرو اور بے حیائی کی باتوں سے باز آؤ ۔

سو اب تم سُسر بن گئے ہو اس لیے مولوی صاحب کی بات پر عمل کرو ۔

سب کو پیار فقط —— مخلص —— فیض

اب ایسے خط ہمیں کون لکھے گا ۔ اس شہر میں ، جہاں صوفی صاحب بھی نہیں ۔ فیض اور دامن بھی چلے گئے اب ہم یہاں کیوں آئیں گے ۔

ساز لیج آمادہ ہے سب چلنے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

احمد ندیم قاسمی

دستِ صبا

(۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی صدارت میں فیض کے مجموعہ کلام "دستِ صبا" کی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی تھی۔ فیض ان دنوں محبوس تھے یہ مضمون اس تقریب میں پڑھا گیا تھا۔)

ہمارے ملک اور بیرونِ ملک کے تمام ادب دوست احباب اس بات پر متفق ہیں کہ فیض احمد فیض اس دور کا مقبول ترین شاعر ہے اور میرے خیال میں آپ اس بات پر بھی متفق ہوں گے کہ فیض کے دوسرے مجموعہ کلام "دستِ صبا" کی اشاعت ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے خصوصاً ان حالات میں کہ ہر طرف ادب میں جمود و تعطل اور ادب کی جمالیاتی قدروں کے عام انحطاط کے تذکرے ہو رہے ہیں ہر لب پر ہماری تہذیبی زندگی کے سپاٹ پن اور بے رس کے گلے ہیں اور ہر شخص کو شکایت ہے کہ وہ کسی اچھی سی نظم کسی پیاری سی غزل اور ذہن میں کھب کر رہ جانے والے کسی البیلے سے شعر کے لیے ترس گیا ہے۔

آج سے گیارہ برس پیشتر فیض نے اپنے مجموعہ کلام "نقشِ فریادی" کے دیباچے میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

"ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دست نگر رہتی ہے اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے یا ان کے اظہار کے لیے کوئی سہل رستہ پیشِ نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے یا طریقِ اظہار کو۔ ذوق اور مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے اہلِ محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔"

پڑھنے والے ہراساں ہو گئے تھے کہ اب فیض شاعری سے دست کش ہو کر عزلت نشینی کی زندگی

بسر کرنے کے درپے ہے اس کے موضوعات کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ اپنے تمام تجربات واحساسات کو "نقشِ فریادی" کے اشعار میں سمو کر وہ خالی ہاتھ ہو کر رہ گیا ہے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ آئندہ شعر کہہ کر وہ اپنے ہی خیالات کی تکرار کا مرتکب ہوگا بعض لوگوں نے اسے فیض کے فنی خلوص اور ادبی دیانت پر محمول کیا، مگر ملک کے تمام ادبی حلقوں میں اس تشویش کا بھی اظہار ہونے لگا تھا کہ فیض نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا ہے۔ اور ہمارے تہذیبی افق پر جو ستارہ بڑی آب و تاب سے جگمگانے لگا تھا، ٹوٹ جانے والا ہے "نقشِ فریادی" کی اشاعت کے بعد عرصے تک فیض کا سکوت اس شبے کو یقین میں بدلتا رہا، پھر چند نظمیں خاصے طویل وقفوں میں ہمارے سامنے آئیں جن سے شاعر کی زندگی کا ثبوت ضرور ملتا رہا لیکن فیض کو سمندر سمجھنے والے اس کی اس گاہے گاہے کی شبنم افشانی کے شاکی رہے۔ خود فیض نے اپنے قریبی دوستوں کو بارہا بتایا کہ وہ مہینوں ایک مصرعے یا ایک شعر کو ذہن میں لیے پھرتا ہے اور آگے نہیں بڑھ پاتا پھر فیض کی مشہور غزل۔

ع   ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

اور وہ قوالی "ہم بھی دیکھیں گے"۔ اور وہ غیر فانی نظم "شورشِ بربط و نے" (جس کا عنوان بدل کر دو آوازیں کر دیا گیا ہے) معمول سے ذرا کم وقفوں میں شائع ہوئیں تو لوگوں کی ڈھارس بندھی اور اس کے بعد تو فیض کے تخلیقی جذبے میں کچھ ایسی بشارت آگئی کہ ہر ہفتے نہیں تو ہر مہینے اس کی کوئی نہ کوئی نئی غزل یا نظم ایک خوشگوار تواتر سے شائع ہونے لگی اور مقام مسرت ہے کہ فیض نے اپنے انکسار سے جو غلط تاثر پیدا کیا تھا اسے خود ہی بے معنی قرار دے دیا اور اس کا ثبوت "دستِ صبا" کی صورت میں آپ کے سامنے ہے "نقشِ فریادی" کے مقدمے میں ن۔م۔ راشد نے لکھا تھا۔ "فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے" دراصل یہ فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا کہ فیض ایک مرکزی نظریے کا شاعر ہے اور اس لیے پاکیزہ جاندار اور توانا احساسات کا شاعر ہے، پہلے میں اسے ن۔م۔ راشد کی غلطی نہیں کہوں گا کتابت ہی کی غلطی کہوں گا کیونکہ راشد کو تو یقیناً اس بات کا علم ہوگا کہ فیض کے نرم و نازک حسین و جمیل اور زندگی سے لبریز احساسات صرف ایک صحت مند مرکزی نظریے ہی کی تخلیق ہو سکتے ہیں۔ اور کسی مرکزی نظریے سے عاری شعراء تو وہ ہوتے ہیں جو زندگی کی صرف عکاسی یا صرف نقاشی کو اپنے فن کی معراج قرار دے لیتے ہیں حسن اور غلاظت میں انتخاب نہیں کر پاتے، زندگی کی نباضی سے بیگانہ رہتے ہیں اور یوں حسن کار کے اس منصب سے محروم رہتے ہیں جس کا دوسرا نام انسانی مزاج و کردار کی معاری ہے، فیض زندگی کا نباض ہے اس کا فن کسی تاریخی شعور کی مدد سے زندگی کے ارتقائی رخ یعنی اس کے نامیہ رجحان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے

بلکہ بعض اوقات اس سے آگے بھی بڑھ جاتا ہے۔ زندگی اور انسان کا ارتقاء اور ارتفاع ہی ہمیشہ اس کا مرکزی نظریہ رہا ہے اور اسی لیے وہ حسین اور سچے اور تنومند احساسات کا شاعر ہے یہ درست ہے کہ وہ بعض اوقات خود اپنے آپ سے سرگوشی کرنے لگتا ہے لیکن بعض سرگوشیاں ایسی بھی تو ہوتی ہیں۔ جن میں گونج ہوتی ہے اور جن کی حیثیت کائناتی ہوتی ہے۔ غالب کا یہ شعر اپنے آپ سے نیک سرگوشی ہی تو ہے۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

لیکن یہی شعر غالب کے دور کی معاشرتی تاریخ بن جاتا ہے فیض کی سرگوشیوں کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے در اصل فیض ان شاعروں میں سے نہیں جو خلا میں شاعری کرتے ہیں۔ اپنے ماحول سے کٹ کر مراقبہ کرتے ہیں اور اپنی روحوں پر اشعار کے نازل ہونے کا انتظار کرتے ہیں، فیض نے تو آج کی دنیا کے جملہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی محرکات کے شور و شغب میں شعر کہے ہیں اور جو کچھ کہا ہے بڑے اعتماد سے کہا ہے اس لیے کہ اسے ساری دنیا میں ابھرتے ہوئے نئے انسان کی صلابت اور قوت پر اعتماد ہے اور اسی لیے اس کا نغمہ ارضی بھی ہے اور رجائی بھی۔

ایک بات جو "نقش فریادی" اور "دست صبا" میں یکساں نمایاں نظر آتی ہے وہ ہماری اردو شاعری کی قدیم روایتی علامات اور تصورات کا احترام اور فن کے نئے تقاضوں کے مدنظر ان کا فنکارانہ استعمال ہے فیض کو ماضی کی ادبی روایات پر بڑا عبور حاصل ہے وہ تلمیحیں اور رمزیں اور کیفیتیں جن سے ہمارے کلاسیکی شاعری بھری پڑی ہے، فیض کے ہاں ذرا زیادہ بھرپور معنویت کے ساتھ اس لیے نظر آتی ہیں کہ میر، سودا، غالب، مومن اور حالی و اقبال کی قائم کی ہوئی اور برتی روایات کا احترام کرتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ تراکیب و الفاظ کی بھی ایک تاریخ اور ایک روایت ہوتی ہے اور ہر لفظ کتنے ہی ادوار کی نازک نازک جزئیات کو سمیٹے ہوئے ہم تک پہنچتا ہے فیض کو الفاظ کی تاریخ کے شعور کے ساتھ ہی مسکراہٹوں، آنسوؤں اور امنگوں کی تاریخ کا بھی شعور ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری حسن صورت اور حسن معنی کا بڑا حسین امتزاج ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہیئت اور موضوع کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش ایسی ہی بیکار معلوم ہوتی ہے جیسے گوشت سے ناخن جدا کرنے کی کوشش، فیض کے کلام میں نغمہ اور فکر آپس میں یوں گھل مل گئے ہیں کہ یہ دونوں خصوصیات ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم محسوس ہونے لگتی ہیں اور پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ فیض کی فکر آتنی شاداب

اور ہری بھری نہ ہوتی تو اس کے کلام میں یہ نغمگی کہاں سے آتی اور اگر فیض کی نغمگی میں انتشار نہ ہوتا۔ تو اس کے کلام میں یہ فکر کی گہرائی اور گمبھیرتا کہاں سے آتی، شعر ایک جمالیاتی تاثر ہے اس لیے شعر کا جمیل ہونا اس کے شعر ہونے کی نہایت اہم شرط ہے عام گفتگو میں ایک خیال کو یوں ادا کیا جائے گا کہ "میں ان دنوں بہت متفکر ہوں اور فکروں کے اس ہجوم نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے، غالب اس خیال کو شعر کی صورت میں یوں ڈھالے گا۔ ؎

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

صاف ظاہر ہے کہ دونوں "اظہاروں" میں صرف ایک فرق ہے، جمال کا حسن کا، اسلوب اور انداز کی آراستگی اور دلفریبی کا۔ اور فیض نے نہ تو "نقشِ فریادی" میں اس حقیقت کو فراموش کیا تھا۔ اور نہ "دستِ صبا" میں۔

"دستِ صبا میں تو اس کی خود فضیلی بھی ایک حسن بن گئی ہے، فیض ایک بڑا احساس شاعر ہے، اور ضرورت سے زیادہ حساسیت اکثر جھلاہٹ پر منتج ہوتی ہے، مگر فیض کے ذہن میں جمالیاتی شعور اس حد تک رچا ہوا ہے کہ وہ طیش میں نہیں آتا۔ کف نہیں لڑاتا۔ گاتا اور مسکراتا ہوا وہ ذہنوں میں اتر جاتا ہے۔

یہاں "دستِ صبا" کی ایک اور خصوصیت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اور وہ ہے تشبیہات و استعارات کا استعمال "نقشِ فریادی" اس خصوصیت سے بالکل عاری تو نہیں۔ لیکن وہاں فیض اثر آفرینی کے لیے تشبیہات کی مدد ذرا کم ہی لیتا ہے "دستِ صبا" میں فیض نے یہ کمی پوری کر دی ہے اور پھر یہ تشبیہات ایسی نہیں کہ دوراز کار تلمیحات بن جائیں۔ اور ہمیں "انسائیکلو پیڈیا برے ٹینیکا" سے رجوع ہونے پر مجبور کر دیں یہ تشبیہات ہمارے تجربات و مشاہدات سے براہ راست متعلق ہیں اس لیے ہم ان کے لیے مطالعہ سے آسودگی محسوس کرتے ہیں اور یوں شعر کی یا موضوع کی معنویت چمک اٹھتی ہے۔

"دستِ صبا" کی غزلوں کے تذکرے کے بغیر یہ مختصر سی تعارفی بات چیت نامکمل رہ جائے گی۔ فیض نے اس دوران میں غزلیں شاید نظموں سے زیادہ کہی ہیں اور میرے نام کے ایک خط میں فیض نے اس بات کی توجیہہ یوں کی ہے کہ چونکہ نظم کے لیے یکسوئی، ریاضت اور ذہنی و حیاتی مرکزیت درکار ہوتی ہے اس لیے محض تن آسانی کی خاطر غزل کہہ لی جاتی ہے یا شاید یہ رجحان قدما کی فنی

روایت سے عرصے تک کترائے رہنے کا ایک صحت مند ردِ عمل ہو (الفاظ یہ نہیں تھے لیکن مفہوم کچھ ایسا ہی تھا) جو کچھ بھی ہو جو غزلیں فیض نے کہی ہیں وہ تن آسانی کا ثبوت تو قطعی نہیں، ہر غزل کے جملہ اشعار میں ایک معنوی اور ماحولی تسلسل قائم رکھنا اور پھر جذبے اور تاثر، لہجے اور فضا کی وحدت قائم رکھنا بڑی جگر کاوی کا کام ہے اور سب پر مستزاد یہ کہ غزل جو عموماً داخلی یا شخصی چیز ہوتی ہے فراق کی طرح فیض کے ہاں بھی آفاقی چیز ہو گئی ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے ان غزلوں میں کلاسکی اردو شاعری کی علامات و تصورات اور تلمیحات کا بڑا ہی خوبصورت استعمال ہے، فیض نے قدیم شاعری کی حسین خصوصیات کو نئے دور کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے اور ایک سچے حسن کار کی طرح ان کو تازگی اور نئی زندگی بخش دی ہے۔

فیض احمد فیض کا فن کسی تعارف کا اور کسی کے بھی تعارف کا محتاج نہیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں محض رسماً "دستِ صبا" کے بارے میں کچھ کہہ دوں، لیکن جب میں یہ رسمی بات چیت لکھنے بیٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ "دستِ صبا" ایسے شعری کارنامے کے سلسلے میں رسماً کچھ کہہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب شاعر پڑھنے والے کے ذہن کو اپنی بھرپور گرفت میں لے لے تو رسم پڑتے پختہ اعتماد کو اپنی جگہ دے دیتی ہے اور میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔

آخر میں مجھے ایک خوشگوار فرض ادا کرنا ہے مجھے پاکستان کے ادب دوست حلقوں کی طرف سے جناب رجسٹرار صاحب "سپیشل ٹریبونل راولپنڈی کانس پریس کیس" کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے فیض کو "دستِ صبا" کی بیشتر مندرجات کی تصنیف اور ترتیب اور ساتھ ہی اس کتاب کی اشاعت کی اجازت دی اور "دستِ صبا" کے مصنف اور شاعر کو اردو ادب کے سرمائے میں ایک عظیم اضافہ کا موقع بخشا۔
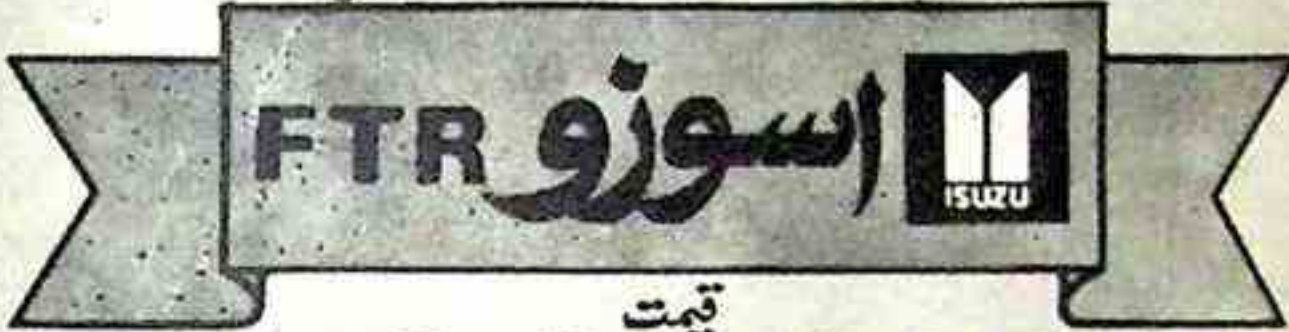
کنہیّا لال کپور

پھر نظر میں پھول مہکے

ہمیں وہ دن کل کی طرح یاد ہے جب فیض احمد فیض ساون کی کالی گھٹا کی طرح اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمانِ ادب پر چھا گئے۔ لارڈ بائرن کے برعکس انہوں نے اپنے کو ایک صبح نہیں ایک شام کو مشہور و مقبول پایا۔ یہ شام (غالباً) جولائی ۱۹۳۵ء کی تھی۔ جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں اس دور کے ممتاز شعراء (ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔ صوفی غلام مصطفٰے تبسم۔ حفیظ جالندھری۔ ہری چند اختر۔ عابد علی عابد۔ اختر شیرانی۔ چراغ حسن حسرت۔ احسان بن دانش وغیرہ) نے شرکت کی تھی۔ فیض کو جن کی عمر اس وقت چوبیس سال تھی۔ مشاعرہ کے دستور کے مطابق شروع میں پڑھوایا گیا۔ انہوں نے ایک قطعہ اور دو نظمیں پڑھیں۔ نظمیں تھیں —— "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"، اور "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" —— اور قطعہ تھا۔

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

مشاعرہ لوٹ کر جب فیض اسٹیج سے اترے۔ ہر شخص کی زبان پر یہ سوال تھا۔ یہ جواں سال مگر پختہ فکر شاعر کون ہے؟ اس نے یہ اندازِ بیاں کہاں سے اُڑایا؟ دوسرے دن ان کا قطعہ اور دونوں نظمیں لاہور کے ہر روزنامہ میں خاص اہتمام کے ساتھ شائع کی گئیں۔ اور فیض کا شمار ان شعراء میں ہونے لگا جو اپنی ذات میں ایک نیا رجحان یا نئی تحریک

ہوتے ہیں۔

فیض کی پہلی کتاب "نقشِ فریادی" جس دن شائع ہوئی۔ اس روز میں اتفاق سے مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر "ادبی دنیا" کے پاس ان کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں عاشق حسین بٹالوی تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کتاب تھی انہوں نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا یہ ہے وہ "دیوانچہ" جس کا چھپنے سے پہلے اتنا چرچا تھا۔ دیکھیے نام کتنا مہمل ہے "نقشِ فریادی"۔ مولانا صلاح احمد بولے "نام کو چھوڑ دیئے۔ یہ کہیے اس میں کوئی کام کی چیز بھی ہے۔؟"

"صرف ایک شعر ہے، ایک غزل کا مطلع "،

"بس"

"جی ہاں۔ آگے خدا کا نام ہے"

"وہ شعر کونسا ہے؟"

"شعر ہے ——

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

شعر سن کر مولانا موصوف اور ہم دونوں چونک اٹھے۔ بلاشبہ یہ شعر نہیں نشتر تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ جو شخص اس پائے کا شعر کہہ سکتا ہے، اسے بہت کچھ معاف کیا جا سکتا ہے، اگر وہ یہ شعر لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دے۔ ہم تو تب بھی اسے شاعر تسلیم کریں گے بعد میں جب نقشِ فریادی کا مطالعہ کیا۔ پتہ چلا۔ عاشق حسین بٹالوی نے مبالغہ سے کام لیا تھا۔ کیونکہ "نقشِ فریادی" میں متعدد کام کی چیزیں تھیں مثال کے طور پر "تنہائی" "موضوعِ سخن"، "چند روز اور مری جان"، "رقیب سے" "کتے"، "ہم لوگ"، "سوچ"، "آج کی رات سازِ دردِ نہ چھیڑ"، "اور میرے ہمدم میرے دوست"۔ ان نظموں کے کچھ اشعار اور بند دوسرے شعرا کی نظموں پر بھاری تھے۔ مثلاً۔

جسم پر قید جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

نقشِ فریادی کی ایک نظم "تنہائی" کا میں خاص طور پہ ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس لیے نہیں کہ میں نے اپنے ایک مضمون میں اس کی پیروڈی کی تھی۔ بلکہ یہ نظم کرشن چندر مرحوم اور مجھے از حد پسند تھی۔ اگست ۱۹۳۹ء میں ہم پہلگام میں تھے۔ ایک روز جب کرشن چندر سو رہے تھے۔ ڈاکیہ "ادبی دنیا" کا تازہ پرچہ لایا۔ میں نے جونہی اسے کھولا، میری نظر فیض کی نظم تنہائی پر پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شاعر نے ایک مختصر نظم میں حیات و کائنات کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ میں نے کرشن چندر کو جگاتے ہوئے کہا "اٹھیے صاحب۔ دیکھیے فیض نے ایک نیا طلسم توڑا ہے"، وہ ذرا جھنجھلا کر اُٹھے۔ مگر جب انہوں نے نظم ملاحظہ فرمائی۔ بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا "بخدا! یہ الہام ہے۔ باقی سب شاعری ہے!" ہم دونوں نے بعد میں وہ نظم اتنی بار پڑھی کہ وہ ہمیں زبانی یاد ہو گئی ہر صبح لہک لہک کر اسے گنگنانا ہمارا معمول ہو گیا۔ بڑی مدت کے بعد ہمیں پتہ چلا۔ صرف ہم ہی نہیں فراق گورکھپوری اور پروفیسر کلیم الدین احمد بھی اس نظم کے قائل اور قتیل ہیں۔ فراق کی رائے میں "تنہائی" ایک زندہ جاوید کلاسک ہے اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے نزدیک یہ فیض کی بہترین نظم ہے۔

فیض کے دوسرے مجموعۂ کلام "دستِ صبا" میں جو ان کی اسیری کے دوران شائع ہوا "صبحِ آزادی" "دو آوازیں" اور "نثار میں تیری گلیوں پہ" لافانی نظمیں ہیں مؤخر الذکر فیض کی وہ نظم ہے جس میں سیاست اور تغزل کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو صرف فیض کا ہی حصہ ہے۔ اسی مجموعہ کی ایک اور قابلِ ذکر نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" ہے جس کی نمایاں

خوبی یہ ہے کہ اس میں سیاسی نعرہ زنی سے احتراز کیا گیا ہے۔ تاکہ نظم طبع حزیں پہ گراں نہ گزرے فیض کے تیسرے مجموعۂ کلام "زنداں نامہ" میں چند نظمیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ جیسے "دریچہ" "ملاقات" اور "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" ان میں آخری نظم مرحوم روزن برگ کا مرثیہ ہے۔

بارہا میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا ہے۔ آخر فیض کی بے پناہ مقبولیت کا راز کیا ہے؟ کیا وہ اس لیے ایک عظیم شاعر ہے کہ جب وہ انقلاب کا ذکر کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے۔ جیسے عمر خیام، کارل مارکس پر ایمان لے آیا ہے۔ کیا وہ اس لیے مقبول ہے کہ اس نے تغزل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا؟ کیا اس کا شمار اردو کے ممتاز شعراء میں اس لیے ہوتا ہے کیونکہ اس کا لہجہ منفرد ہے؟ کیا اُسے اس لیے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس کہنے کو کچھ ہے اور اسے کہنے کا ڈھنگ آتا ہے؟ کیا اُسے اس لیے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے کہ اسکے انداز بیان میں غیر معمولی ایجاز اور اختصار پایا جاتا ہے۔ میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس کی قابلِ رشک مقبولیت کے لیے اس کی شاعری کا کونسا وصف ذمہ دار ہے۔

ایک انگریزی نقاد کے نزدیک اعلیٰ اور ارفع شاعری میں تین "ایس" پائے جاتے ہیں۔ وہ ہیں سینس SENSE ساؤنڈ SOUND اور سجیشن SUGGESION جنہیں اردو میں "مغز" "موسیقیت" اور "رمزیت" کہہ سکتے ہیں۔ میری رائے میں فیض کی شاعری میں یہ تینوں "ایس" بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ فیض ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ مگر وہ اوّل اور آخر شاعر ہیں خطیب یا مبلغ نہیں۔ پراپیگنڈا کے بارے میں ان کا وہی نظریہ ہے۔ جو جگر مرادآبادی کا حُسن کے بارے میں تھا۔ ؎

حسُن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

وہ اشتراکی اقدار کا پرچار کرتے ہیں مگر کچھ اس انداز سے کہ قاری کو بے اختیار یہ شعر یاد آجاتا ہے: ؎

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

فیض ایک "ایسا بُت" ہیں جسے توڑنے کی بڑے بڑے بت شکنوں نے سعی کی ہے

اس ضمن میں خاص طور پر نیاز فتح پوری، رشید حسن خان شاہ جہان پوری اور اثر لکھنوی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان سب نے فیض کے کلام میں زبان و بیان کی غلطیاں نکال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فیض شاعر تو کجا متشاعر بھی نہیں۔ مگر جب ان کے ہتھوڑے اور تیشے اس بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ذرا استانے لگتے ہیں، یہ ٹکڑے از سر نو اکٹھا ہو کر اس خوبصورت بت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کا نام فیض احمد فیض ہے اور جو اپنے تنقیص نگاروں کو مخاطب کر کے اپنی نرم۔ شیریں اور مدھم آواز میں کہتا ہے ؎

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

رُوح افزا
اس کی سب سے اچھی تعریف یہ ہے کہ
"یہ سب سے اچھا ہے"
مشروبِ مشرق رُوح افزا کی یہ تعریف بے شمار باذوق شائقین کی پسندیدگی کی سند ہے۔
رُوح افزا کی فروخت دوسرے تمام شربتوں کی مجموعی فروخت سے کہیں زیادہ ہے
... یہ اس کی تعریف کا عملی ثبوت ہے۔
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں سب سے اچھا
روحِ پاکستان - رُوح افزا
راحت جان - رُوح افزا
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے
ADARTS
HMD-8/87

مشتاق احمد یوسفی

اپنے عہد کی آواز — فیض

پچھلے دنوں موت نے ہم سے اس دور کا سب سے بڑا افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی اور ہمارے عہد کا سب سے بڑا شاعر فیض احمد فیض چھین لیا۔ اردو نثر اور نظم کی تاریخ میں اس سے ظالم عشرہ کبھی نہیں آیا اور آج جب اپنے محبوب شاعر کی موت پر ہم سب یہاں ایک دوسرے کو پرُسا دینے آئے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ زرد پتوں کا وہ بن جو ان کا دیس ہے۔ درد کی وہ انجمن جو ان کا دیس ہے، آج اُن کے غم میں بہت اُداس ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور آخرش اپنے پیدا کرنے والے کی طرف لوٹنا ہے۔ فیض صاحب اس طرح جیے جس طرح جینا چاہیے اور یوں شتابی رخصت ہوئے جس طرح وہ رخصت ہونا چاہتے تھے۔

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے۔
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف وداع کی صورت
للہ الحمد ! با انجام دِل دِل زدگاں
کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا۔ کوئی مثال ایسی یاد نہ آئی جہاں لوگوں کو شاعر کے سیاسی مسلک سے ایسا شدید اختلاف رہا ہو اور اس کی شاعری سے ایسا ٹوٹ کے پیار۔ فیض صاحب کا سیاسی مسلک ہمیشہ ہی متنازعہ فیہ رہا۔ ان کی شخصیت اور شاعری ہمیشہ ہر تنازعہ سے بالاتر رہی۔ شاید ہی کوئی شاعر اپنی زندگی میں اس طرح چاہا اور سراہا

گیا ہو۔ جس طرح فیضؔ صاحب۔ اور کون ہے جس نے اپنی زندگی میں نصف صدی سے زیادہ اقلیم سخن میں دلوں پر یوں راج رچا ہو، اور اتنی محبتیں اور عقیدتیں سمیٹی ہوں؟

اردو ادب کی تاریخ میں تین اہلِ قلم ایسے گزرے ہیں جن کی ذاتی شرافت و شائستگی اور عظمت و برگزیدگی ان کی تحریر سے بھی جھلکتی ہے۔ یہ تینوں اپنے مزاج و اقدار کی بلندی شیرینی اور شائستگی کو اپنے الفاظ میں سمو دیتے ہیں اور اپنے لہجے میں اپنے کردار کا سارا حسن لے آتے ہیں۔ یہ ہیں خواجہ الطاف حسین حالیؔ، رشید احمد صدیقی اور فیض احمد فیضؔ۔ جہاں قول، فعل کو اپنے پیچھے ہانپتا ہوا چھوڑ آئے وہاں حرف اپنی حرمت و تاثیر کھو دیتا ہے۔ خالی ظرف کی طرح لفظ بھی جتنے تھوتھے ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ بجتے ہیں۔

چھچھلے آنسو، چھچھلی آگ
کچا پانی، کچی آگ

حرف بے تاثیر بومرینگ کی مانند ہر بار شاعر کے پاس واپس آجاتا ہے جو حرف کسی تجربے اور آدرش کی آنچ پر نہ تپایا گیا ہو وہ کبھی دل میں نہیں اُترتا، یہ بات نہ عُتنائی سے آتی ہے نہ عروض و ریاض سے شاعری میں فیضؔ کا رشتہ اہلِ قال سے نہیں، اہلِ حال سے ملتا ہے انہوں نے اس رمز کو ابتدا ئے سفر ہی میں پالیا کہ صرف

ایک جذبۂ صادق اور سوزِ دروں ہے جو
حرف سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

فیضؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات چھ سال پہلے مخدومی ماجد علی صاحب کے یہاں ہوئی بہت سے نیازمند فیضؔ صاحب کا حلقہ کئے بیٹھے تھے مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کسی نے فیضؔ صاحب سے میرا تعارف کرایا یا نہیں۔ بہر حال میں دو گھنٹے تک حسبِ معمول و موقع، خاموش بیٹھا مزے مزے کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ دوسرے دن علی الصبح عزیز گرامی افتخار عارف کا فون آیا کہ فیضؔ صاحب آپ کے یہاں آج کسی وقت آنا چاہتے ہیں۔ ہُوا یہ کہ آپ کے جانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو اپنی بیگم کے پہلو میں سر نہوڑائے، گم صم بیٹھے تھے وہ کون تھے؟ میں نے انہیں بتایا کہ وہ یوسفی صاحب تھے اور یہ ان کا نارمل پوز اور پڑوس ہے۔ فیضؔ صاحب کہنے لگے "تم نے تعارف کیوں نہیں کرایا؟ میں نے کہا فیضؔ صاحب میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ یوسفی صاحب سے کبھی نہیں

ملے ۔ کہنے لگے " ہاں کچھ ایسا ہی ہے ۔ مجھے بڑی ندامت ہے، صبح ہی مجھے لے چلو ۔
میں نے افتخار عارف سے کہا " فیض صاحب سے عرض کر دیجئے کہ آج شام عطّار خود حاضرِ خدمت ہو کر اپنے مُشک کا تعارف کروا دے گا ۔ جائے واردات وہی مرجعِ خلائق ماجد علی صاحب کا دولت کدہ ۔ شام کو ملاقات ہوئی تو فیض صاحب اتنے محجوب تھے کہ مجھے خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود کو اس کوتاہی پر بھی قصور وار ٹھہرا رہے ہیں کہ میری اور ان کی ملاقات پندرہ بیس سال پہلے کیوں نہ ہوئی! فیض صاحب کے اِس انکسار اور حسنِ اخلاق سے میں اس لئے اور بھی متاثر ہوا کہ مجھے نہ جانے کیوں اب بھی یقین ہے کہ اس وقت تک انہوں نے میری کوئی تحریر نہیں پڑھی تھی ۔ سُنی سنائی تعریف پر ایمان لے آئے تھے ۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ کم سخن تھے اور میں حسبِ معمول اپنے خول میں بند اور جب دونوں بزرگ فریق شرمیلے واقع ہوں تو برخوردار افتخار عارف کا طُوطی اگر بولے نہیں تو کیا کرے ۔

بعض باتیں ایسی ہیں جو فیض صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں ، مثلاً انہیں کبھی روپے کا ذکر کرتے نہیں سُنا ، اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سُنا ۔ زمانے کی شکایت یا اپنے سیاسی مسلک کے بارے میں نثر میں کبھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سُنا ۔ کسی کی غیبت اور بُرائی نہیں سُن سکتے تھے ۔ کوئی ان کے سامنے اَدبدا کر کسی کا ذکر بہ بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن ، زبان اور کان سب سوئچ آف کر دیتے تھے ۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا " آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی " میں نے کہا " فرصت اور فراغت تو بہت ہے مگر کاہل ہو گیا ہوں ۔ پتا نہیں مارا جاتا ۔ مطالعہ کی عیاشیوں میں پڑ گیا ہوں اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے لگے تو سمجھیے حرام خوری پر اُتر آیا ہے " میں بہت دیر تک خود کو اِسی طرح بُرا بھلا کہتا رہا ۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنے نزدیک آ گئے کہ ان کی سگریٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی ، کہنے لگے " بھئی ہم کسی کی غیبت نہیں سُن سکتے ، کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں ۔ اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیے ۔ درگزر ثواب کا کام ہے "

فیض صاحب کی بارہ مصرعوں کی نظم " بول " کو ان کا عہد نامہ اور THE

THE TES TAMENT OF THE THIRD WORLD. کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔
یہ نظم آج سے کم و بیش پچاس سال پہلے کہی گئی تھی جب برٹش راج اپنے عروج
پر تھا اور زبان کھولنے پر قدغن تھا۔ اس میں ان کے جری لہجے کی گونج صاف
سنائی دیتی ہے مدھم مگر مضبوط سروں کی اٹھان کے بعد وہ اپنی رجز کی لے تیز کر دیتے ہیں
ہر چوتھی لائن کے بعد ٹیپو، بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ رجز خواں کے نفس گرم کی
آنچ محسوس ہونے لگتی ہے اور آخری بند میں اس کے لحن میں عہد عتیق کی بشارتوں کا جاہ و
جلال گونج اٹھتا ہے۔

اور یہ فیض کے کلام کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنے کلام کو بگاڑ کر پڑھنے کی انتہائی
کوشش کے باوجود ان کے چاہنے والوں کو یہ انداز ایسا بھایا کہ آخر کو یہی معیار ٹھہرا۔
ان کا اُکھڑا اُکھڑا انداز دیکھتے دیکھتے ایک فیشن بن گیا۔ فیض صاحب "چین اسموکر" تھے
میرا مطلب ہے کہ سگریٹ سے سگریٹ ہی نہیں تالیں بھی سلگاتے رہتے تھے۔ مصرع اور فقرہ
کی سانس ٹوٹ ٹوٹ جاتی، وقفے وقفے سے ایک گھائل سی سسکی بھی سنائی دیتی اور سننے
والوں کا پیار سکوتِ سخن میں حلاوتیں گھولتا چلا جاتا۔ کسی کہنے والے نے ازراہِ تفنن یہ
کہا بھی کہ فیض صاحب نے دراصل اپنے نقالوں کا خانہ مزید خراب کرنے کے لئے تحت اللفظ
پڑھنے کی یہ طرز ایجاد کی۔

بات خواہ داغ داغ اُجالے کی ہو یا دریچے میں گڑی صلیبوں کی، نظم کا عنوان "آج
کی رات" ہو یا "سر وادیٔ سینا" یا "آج بازار میں پابجولاں چلو"، فیض صاحب کا اصل
موضوع اول تا آخر انسان کا دُکھ رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ دُکھ کسی
اندھی مشیت کا پیدا کردہ نہیں ہے انسان کے دُکھ کا سب سے المناک پہلو یہی ہے کہ
اس کے پیچھے ہمیشہ کسی نہ کسی انسان یا غولِ انسانی کا ہاتھ نظر آتا ہے غالباً یہی اس کا
روشن پہلو بھی ہے اس لئے کہ مرض قابلِ علاج و تدارک ہے۔ تیسری دُنیا کے دکھ اور اس
کے اسباب اور مختلف پہلوؤں پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ تیسری دُنیا کا اصل دکھ بھوک
اور قحط نہیں ہے۔ تیسری دنیا کا دُکھ قحط الرجال بھی نہیں ہے جس کا اتنا رونا رویا جاتا
ہے۔ جناب والا، تیسری دنیا قحط الرجال کی نہیں، قہر الرجال کی ماری ہوئی ہے۔
جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، فیض صاحب کے سیاسی مسلک سے لوگوں کو اختلاف

رہا ہے اور میں بھی انہی میں سے ہوں، لیکن آزادی، احترام آدمیت اور انسانی اقدار کی پاسداری
جس پامردی اور استقامت سے انہوں نے کی وہ لائق تحسین و تکریم ہے جس مسلک کج کلاہی
کی سمت انہوں نے ایک دفعہ اپنا قبلہ راست کرلیا پھر اُسے تا عمر نہیں بدلا اور اپنے
اسی عہد وفا میں علاج گردش لیل ونہار ڈھونڈا اور انہوں نے یہ اس زمانے میں کیا جب
مصلحت کدہ میں ایسے لکھنے والوں کا سکہ چلتا تھا جو ہر کھیل کے بعد اپنے ANTENNA
کا رُخ بدلتے رہتے تھے بلکہ بعضے تو دوسرے کے "انٹینا" میں اپنا تار جوڑ کے "تماشائے
اہل قلم دیکھتے ہیں" کتنے ایسے ہیں جو نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں؟ بدلتی
رُت کے ساتھیوں نے وفاداریاں بدلیں، مسلک بدلے۔ کچھ دکھیاروں پر تو ایسا بجوگ
پڑا کہ انہوں نے مارے ڈر کے فقط مشرب ہی نہیں بدلا مشروب بھی بدل دیا یعنی سادہ
پانی پی پی کے بہکنے اور لڑکھڑانے لگے۔ برگزیدگی کی تلاش میں نکلے تھے صرف گزیدگی ہاتھ لگی۔
ان کا ضمیر تو کیا صاف ہوگا ان بیچاروں کا تو مافی الضمیر تک صاف نہیں۔

فیض صاحب کی صحت یوں تو کچھ عرصے سے ایسی چلی آرہی تھی کہ ہر مرتبہ ہی دھڑکا
لگا رہتا تھا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ وہ بیمار ہوتے اور ہر مرتبہ لوٹ پوٹ کر کھڑے
ہو جاتے۔ چند ماہ پیشتر اپنی بیگم کے ساتھ لندن آئے تو تھکے تھکے ضرور لگے لیکن پہلے
سے کہیں زیادہ صحت مند، اُن کی سانس بھی پھولی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھی، نئے سوٹ
میں وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ دیر تک ایک دلچسپ فلم اور برجو مہاراج کے رقص
کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ چند غزلیں اور نظمیں بھی شوق سے سنائیں۔ آخری زمانے
کے اشعار میں ایک تھکن اور ایک اُداسی ضرور جھلکتی ہے مگر مایوسی نہیں۔ موت کا ذکر بھی
کبھی کنایتاً اور کبھی کھُل کر ملتا ہے مگر زندگی اور شاعری دونوں میں ان کی طبیعت خود رحمی
سے گریز کرتی تھی۔ وہ اپنی موت کا ذکر بھی اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ سُنا ہے اگلے وقتوں
میں لوگ دشمن کی موت کا ذکر کیا کرتے تھے یعنی خوش ہو ہو کر۔

پرسوں لاہور میں ان کے سوگواروں نے مٹی کا حق مٹی کے سپرد کردیا۔ لیکن شاعر
فیض کی موت کے ساتھ ان کا دور ختم نہیں ہوتا۔ شروع ہوتا ہے، بڑے شاعر کی زندگی
اس کی آنکھیں بند ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چشم خود بربست و چشم ما کشاد۔
انہوں نے بڑی بھرپور اور شاداب زندگی گزاری وہ دُنیا اور اہل دُنیا سے کچھ لینے والے

نہیں تھے دینے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے شاعری کو اپنے دور کے دکھ درد سے آشنا کیا اردو کو ایک نیا لہجہ اور آہنگ بخشا۔ "یاد ماضی سے غمگین اور دہشتِ فردا سے نڈھال" لوگوں کو انہوں نے ایک تازہ ولولہ اور جینے کی نئی آس دی۔ سہمے ہوئے لب بستہ انسانوں کو انہوں نے جرأتِ گفتار سکھائی۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے	بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا	بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں	تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے	پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے	جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک	بول، جو کچھ کہنا ہو کہہ لے

فیض اپنے عہد کی آواز نہیں، بلکہ ان کا عہد ان کی آواز بن گیا۔ ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہم نے فیض کو دیکھا۔ آیئے ربِ کریم کا شکر ادا کریں جس نے ہماری نسل کو اس نعمتِ عظیم سے نوازا اور دعا کریں کہ اس بے پایاں پیار کے صدقے جو ان کو اس کے بندوں سے تھا۔ خداوندِ غفور و رحیم ان کو اپنی مغفرتوں سے نوازے۔

اردو مرکز اور لندن یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام تعزیتی جلسے منعقدہ ۲۳ نومبر ۱۹۸۴ء میں پڑھا گیا۔

قرۃ العین حیدر

سرودِ شبانہ

ابھی چند روز قبل علیگڑھ میں مَیں نے نواب مزمل اللہ خاں شیروانی کے صاحبزادے کی ذاتی لائبریری میں ایک نادر و بیش بہا کتاب دیکھی جس کے سرورق پر شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے چند سطور میں اپنے ہاتھ سے سقوطِ بغداد کا احوال قلمبند کیا ہے کس طرح معتول نے دجلہ عبور کیا وغیرہ جلدی میں پوری عبارت نہ پڑھی جو کھجور سے بنی ہوئی روشنائی میں لکھی گئی تھی آخر میں دستخط "مصلح الدین المشتہر بہ سعدیؔ"۔

شیخ سعدی نے بغداد کی تباہی دیکھی تاتاریوں سے بچ کر نکلے تو فلسطین میں صلیبی جنگ جاری تھی وہاں ان کو یوروپین فوجیوں نے پکڑ کر قید میں ڈال دیا دس دینار دے کر حلب کے ایک تاجر نے چھڑایا۔ سعدی کی قیمت دس دینار لگی تھی۔

معاملہ سارا یہی ہے کہ ہر زمانے میں یورش تاتار کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے اور آج ان شہروں پر صلیبی سرداروں کی اولاد اور ان کے ساتھی گولہ باری میں معروف ہیں۔

کن کن شاعروں نے دنیا کو کیا کیا دیا اور دنیا نے ان پر کیا ستم ڈھائے ان کی فہرست بنانا چاہیئے اس میں بھی آفت رسیدہ جہان سوئم کے شعرا ہی بازی لے جائیں گے ہر عہد اپنے ایک شاعر کے ذریعے پہچانا جاتا ہے یہ فیض صاحب کا دور ہے اور یہ دور نقشِ فریادی کی اشاعت کے وقت سے چلا آرہا ہے فیض صاحب کی کمیونزم "روس دوستی" "بھارت نوازی" پنجابیت، بے پناہ مقبولیت، یہ تمام چیزیں آپ کو کتنی ہی کھلتی ہوں آپ ان کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے اب یہ نوبت آچکی ہے کہ مغرب کے

POP - TARS کی ________ GROUPIES. کی طرح خواتین شہروں شہروں فیض صاحب کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں ۔

حال ہی میں جب فیض صاحب لکھنؤ گئے تھے ایک اردو روزنامے نے لکھا کہ فیض احمد فیض پنجابی زبان کے علمبردار اور اردو کے مخالف ہیں لہٰذا ان کی یہاں پذیرائی نہ کی جائے۔ اور بقول ڈاکٹر ایوب مرزا پاکستان کے چند اخبار ان کو بھارت نواز کہتے ہیں۔ رہی ان کی کمیونزم تو وہ الم نشرح ہے۔

فیض صاحب اب ایک SUPER STAR. ہیں۔ اردو افسانہ و ناول نگار کے برعکس اردو شاعر ایک پرفورمنگ آرٹسٹ بھی ہوتا ہے مشاعروں کے ذریعے اس کا گہرا رابطہ عوام سے قائم رہتا ہے اور وہ براہِ راست لوگوں کے دلوں سے بات کرتا ہے۔ فیض صاحب ان خوش قسمت شعراء میں سے ہیں جو خواص و عوام دونوں کو خوش آتے ہیں حالانکہ موصوف بہت قابلِ ذکر پرفورمنگ آرٹسٹ نہیں ہیں نہ ترنم سے پڑھتے ہیں نہ ان کا تحت اللفظ تہلکہ خیز ہے مگر ان کا کلام اتنا سحر انگیز اور دلپذیر ہے اور وہ شخصیت کا ایسا CHAR ISMA. رکھتے ہیں جو بہت کم لوگوں کو میسر آیا ہے۔ دوسرے بہت اہم شاعر ن۔م راشد نے آزاد شاعری کا پودا لگایا لیکن ان کے کلام کے INTELLECTUAL. CONTENT. اور مشکل پسندی نے ان کو خواص تک محدود رکھا یوں بھی ان کے اور فیض صاحب کے رویوں میں بہت فرق تھا۔ ایک بات قابلِ غور ہے۔ اقبال ۔فیض اور راشد تینوں پنجابی، تینوں اس علاقے کے باشندے جس کو ہم نک چڑھے یوپی والے۔ "اک صوبہ پنجاب ہے معلوم نہیں کیوں" الاپ کر اپنی دانست میں گویا بڑا تیر مارا کرتے تھے۔ اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اہلِ پنجاب جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ اردو محاورے اور روزمرہ سے انہیں کوئی سروکار نہیں لب و لہجہ ان کا اتنا مختلف انہیں اردو سے ایسا قلبی لگاؤ کیوں ہوا ؟ مثال کے طور پر پشتو، بلوچی اور سندھی علاقوں نے اردو کے جید شاعر اور ادیب کیوں نہ پیدا کئے یا لکھنؤ اور دلی کے بجائے لاہور اور اردو ادب و صحافت کی راجدھانی کیسے بنا؟

اس کی ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے ۔ انتہائی شائستہ اور تعلیق لیکن شکست خوردہ دلی۔یو۔پی۔بہار ۱۸۵۷ء کے بعد بھی باقی دنیا کو (یعنی ان لوگوں کو جو دادی گنگ و جمن

میں جنم لینے کا شرف نہ رکھتے تھے، BARBARONS سمجھا گئے۔ ان کے برعکس میڈیول پنجاب برطانوی فتح کے بعد اچانک دور جدید میں داخل ہو گیا۔ (پنجابی تاریخی وجوہ کی بناء پر ہمیشہ سے سخت جان اور مہم جو رہا ہے) اور نئے برطانوی دور میں اس کے اندر وہی امریکنوں والی فرنیٹرا سپرٹ FRONTIER SPIRIT پیدا ہوئی ایک لحاظ سے پنجابیوں کو اس برصغیر کا امریکن کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ہم اہل زبان لوگ پنجاب کو "دائیلڈ ویسٹ" ہی سمجھا کئے۔ ہم پنجاب کی اس توانا کلرفل ROBUST کلچر سے ناواقف تھے جو غزنوی عہد سے لیکر سکھوں کے زمانے تک وہاں پھلی پھولی اور جسے میں پنجابی پرشین سکھ کلچر کا نام دے سکتی ہوں اور اس کے پس منظر میں وہ سدھوں جوگیوں اور راجاؤں کا پنجاب تھا اور عہد مغلیہ میں اس نے وہ بڑے صوفی شعرا پیدا کئے جن کی تخلیقات عالمی ادب کے بہترین سرمائے میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ پنجاب کے رومان، وہاں کے لوک سنگیت اور ناچ اور وہاں کی صوفیانہ داستانیں اور صوفیانہ موسیقی یہ ایک علیحدہ دنیا تھی جس پر خود تعلیم یافتہ پنجابیوں نے فخر کرنا کافی عرصے بعد سیکھا۔ چنانچہ ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب میں "پنجابی نیشنلزم" کے فروغ پر ہم کو متعجب نہ ہونا چاہیئے (سوال یہ ہے کہ اگر فیض احمد فیض کی مادری زبان پنجابی ہے تو وہ اس زبان میں بھی شعر کیوں نہ کہیں۔ میں نے لاہور میں فیض صاحب سمیت پنجابی دانشور وہاں کے عوامی شاعر استاد امام دین اور استاد دامن پر بے انتہا فخر کرتے پایا ہے یہ لسانی سوشلزم بھی ہمارے معاشرے کی ایک خصوصیت ہے اقبال جب اپنے آپ کو اکبال کہتے تھے تو اہل زبان ان پر ہنستے تھے خود میں نے ایک مرتبہ فیض صاحب سے کہا تھا کہ خیر ہو تیری بیلاؤں کی " میں پنجابیت بہت ہے۔)

ہائی اسکول میں ایک سبق اس طرح شروع ہوتا تھا ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے ایماء پر لاہور میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی"۔

انگریز کی لسانی حکمت عملی ہر صوبے کے لئے مختلف تھی۔ وادئ گنگ وجمن میں انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ غدر کے بعد مسلم معاشرے کو برباد اور تہ و بالا کر دیا تھا یہاں مسلمان تہذیبی طور پر حاوی رہے تھے لہٰذا ان کو مزید کچلنے کے لئے سرانٹنی میکڈانل نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ پنجاب میں حکومت سکھوں سے چھینی تھی وہاں وہاں ہندو مسلم

سکھ تینوں فرقوں کا طرز زندگی بہت حد تک یکساں تھا پنجابی مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی کرنے کے لئے ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی بھی منظور تھی۔ دہاں اردو "روزی روٹی کی زبان" بنائی جس طرح یو پی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے انہوں نے تجربہ کار دیسی افسر پنجاب کے انتظام اور آبپاشی کی نہریں کھدوانے کے لئے بھیجے اسی طرح اردو پڑھانے والے یو پی سے گئے اور پنجاب نے آناً فاناً ایک عدد علامہ اقبال پروڈیوس کر دیئے اور ان کے بعد ایک سے ایک اچھے مسلمان ہندو سکھ شاعر اور ادیب۔

لیکن اہلِ لکھنؤ اقبال کی زبان پر معترض رہے جس زمانے میں یو پی کے اردو والوں کو غم روزگار لاحق نہ تھا اور نیاز مندان لاہور" ایک دوسرے سے بکثرت چونچیں لڑایا کرتے تھے اب یو پی میں خود اردو کی جان کے لالے پڑے ہیں وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں پنجاب میں زبان اور لوک اور قبائلی کلچر تقریباً یکساں تھی (پنجابی ہندو اور سکھ آج تک خدا کو رب اور ربا کہتا ہے یو پی کا عام ہندو "رب" کہتا ہوا نہیں پایا جائے گا ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نے ان تینوں فرقوں کو مزید ایک لڑی میں پرو دیا صورت حال کا ایک بنیادی تضاد یہ تھا کہ کٹر فرقہ وارانہ رجحانات آریہ سماج، اور مسلم فرقہ پرستی نے بھی پنجاب ہی میں زور پکڑا۔ گو سارا آریہ سماجی پریس اردو میں تھا۔ آریہ سماجی اور سناتن دھرم دونوں لٹریچر اردو میں شائع ہوتے تھے۔ آج تک ہردوار کی دکانوں میں پنجابی زائرین کے لئے زیادہ تر دھارمک کتابیں اردو رسم الخط میں چھپی ہوئی ملتی ہیں)

ایک اردو داں پنجابی ہندو اور سکھ جس پر اقبال اور فیض پر سر دھنتا ہے اس میں لاشعوری طور پر قبائلی بھرد بیک بھی کارفرما ہے جس میں اہل پنجاب ہندو اور مسلمان اور سکھ فیض صاحب کے شیدائی ہیں یو پی اور بہار اور دلی کے مسلمان اور ہندو اکٹھے ہو کر کسی واحد ادبی شخصیت کے لئے اس طرح والہانہ عقیدت کا اظہار نہ کریں گے کیونکہ وادیٔ گنگ و جمن کی لسانی اور تہذیبی ثنویت میں اس طرح کی مشترکہ پرستش کی گنجائش نہیں اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جن کے متعلق ہندی اور اردو والے مستقل ایک دوسرے سے رسہ کشی میں مصروف ہیں۔

لاہور میں محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائیڈ کے بعد مخزن کا دور آیا اس کے بعد کے دور

کے متعلق فیض صاحب نے دست تہ سنگ کے دیباچے میں لکھا ہے "۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجیب طرح کی بے فکری آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی سیاسی تحریکوں کے ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اولاً حسرت موہانی اور اس کے بعد جوش حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی۔ افسانہ میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔

نقش فریادی کے پہلے حصے میں ۲۹-۲۸ء سے ۳۵-۳۴ء تک کی چیزیں شامل ہیں نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو، مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو نہ نجوم ہیں چاندنی کی تہہ میں وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اسی فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے۔ گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا ہوا تھا یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ نقش فریادی کے پہلے حصے کی آخری نظموں میں اسی کیفیت کی جھلک ملتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں فیض صاحب امرتسر کے ایک کالج میں لیکچرر ہو گئے یہاں ان کی ملاقات دہرہ دون کے صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیوی یعنی رشیدہ آپا سے ہوئی۔ رشیدہ آپا نے فیض صاحب کو کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھنے کو دیا جس کو پڑھ کر موصوف پر چودہ طبق روشن ہو گئے گیان حاصل ہونے کے بعد فیض صاحب نے اپنی مشہور نظم لکھی۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔

اسی زمانے میں ۳۶ء میں ترقی پسند تحریک باضابطہ شروع ہوئی۔ ۳۸ء میں علامہ اقبال نے رحلت فرمائی۔ محمد حسین آزاد کے بعد سے لے کر ن م راشد اور فیض احمد فیض کی آمد کے وقت تک اردو ادب پر اقبال کی چھتر چھایا موجود تھی (اقبال غالب کی طرح TIMELESS. اور بہت اونچے تھے ان سے مفر نہ تھی۔ ترقی پسندوں نے ان کو رجعت پسند کہا لیکن اس سے

کوئی فرق نہ پڑا) آل انڈیا ریڈیو کا نیٹ ورک پھیلایا جا رہا تھا۔ پطرس بخاری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل طلبا، جو پنجاب کے دانشوروں کی CREAM سمجھے جاتے تھے بہت سے آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو چکے تھے۔ جنگ چھڑتے ہی لاہور کے ان ہی دانشوروں میں سے ایک کرنل مجید ملک فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں چنے گئے تھے جن کے اصرار پر فیض صاحب نے بھی کنگز کمیشن لے لیا۔ اس وقت حفیظ جالندھری (مصنف شاہنامۂ اسلام) بھی سرکاری سونگ پبلسٹی میں شامل یہ اڑوسن پڑوسن کیسے جو کہے میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے۔ لکھ رہے تھے۔

اب آزاد ایک اور فوٹو گراف کھینچتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے آخری سال قحط بنگال کے متعلق اخبارات میں زین العابدین کی تصویریں چھپ رہی ہیں وامق جونپوری کا بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، مجاز کا "راج سنگھاسن ڈانوا ڈول"۔ اور فیض احمد فیض کی" مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" نوجوانوں کے قومی ترانے" بن چکے ہیں، کنہیا لال کپور کی" غالب ترقی پسند شعراء کی محفل میں" نے آفت جوت رکھی ہے پروفیسر غیظ احمد غیظ کی نظم" نون آیا دلِ زار" بھی سب کو یاد ہو گئی ہے۔

پارک سائیڈ نارتھ قرولباغ دہلی میں چچا مشتاق احمد زاہدی کے مکان کے برابر والے گھر میں لیفٹیننٹ کرنل فیض مع اپنی ولایتی بیوی کے مقیم ہیں چچا زاہدی کے یہاں ضعیف العمر نواب سائل دہلوی آکر تخت پر چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں گویا ایک طرف عہد رفتہ کی آخری یادگار اور دوسری طرف عہد نو کے نقیب کون ہم راشد کے برعکس پروفیسر غیظ احمد غیظ داغ و سائل کی شعری روایت کے مخالف نہیں۔

پارک کی دوسری طرف ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور قریب چند قدم کے فاصلے پر ریلوے کے ظہیر شمسی دونوں کی بیگمات جرمن اتوار کے روز چچا زاہدی کے فرزند اکبر نور الدین احمد بیرسٹر مع اپنی انگریز بیگم نہر سعادت خاں سے آجاتے ان تینوں ولایتی بیگمات کا آپس میں میل جول تھا خصوصاً مسز سلیم الزماں اور مسز نور الدین احمد۔ لیکن ایک روز پارک میں ٹہلتے ہوئے مارگریٹ شمسی نے چپکے سے کہا یہ انگریز لوگ ہمارا دشمن ہے۔ ہمارے ملک کو برباد کر رہا ہے۔" اس زمانہ میں یوروپ میں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا ہلاکو خاں اب ہٹلر کے روپ میں ظاہر ہوا تھا اور کرنل فیض احمد فیض اپنے اینٹی برٹش رویے کے

باوجود برطانوی وردی پہنے فسطائیت کے خلاف انگریزوں کی مدد کر رہے تھے یہ اس وقت کی "پارٹی لائن" تھی اور یہ کانگریسی قوم پرستوں کی لائن سے مختلف تھی۔ چچا زاہدی اور نورالدین احمد دونوں قوم پرست تھے اور ڈاکٹر سلیم الدین صدیقی کے بھائی چودھری خلیق الزماں مسلم لیگ کے لیڈر۔

یہ منظر نامہ بالکل تلپٹ ہونے والا تھا۔ مسٹر ظہیر شمسی اور مارگریٹ شمسی کی بڑی لڑکی آمنہ نے رائل انڈین ایرفورس کے ایک نوعمر انگریز نما پٹھان افسر اصغر خان سے شادی کرلی۔ وہ چودھری خلیق الزماں کی نئی مملکت پاکستان کی ائرفورس میں ایر مارشل تک ترقی کرنے والے تھے لیکن اس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر کم گو اور صاحب آدمی ایک روز پاکستان کی حزب مخالف کا ایک کھدرپوش لیڈر بن جائے گا۔ نہ لیفٹیننٹ کرنل فیض کو مستقبل کے بلوریں پیالے میں شہر بیروت اور لوٹس رسالے کی ایڈیٹری نظر آئی تھی۔

پنڈت نہرو آدمی پہچانتے تھے۔ ۴۲ء میں انہوں نے فیض صاحب سے فرمائش کی تھی کہ وہ "انٹرنیشنل" کا منظوم ترجمہ کریں!

پروفیسر غیظ احمد غیظ نے اپنے دور کی ترجمانی اس طرح شروع کی کہ لوگ چونک اٹھے فیض کا اسلوب ایک پورے عہد کا شعری مزاج اور شناخت بن گیا۔ اور بہت سوں نے کہا کہ موصوف اقبال کے بعد اہم ترین شاعر ہیں۔

ہمارے ہاں ادب میں ایک مشغلہ عرصے سے چلا آتا ہے جس کے ڈانڈے ہمارے سابقہ مشغلے یعنی مذہبی مناظرے سے جا کر ملتے ہیں یعنی ہمعصر اہل قلم کا ایک دوسرے سے موزانہ اور مقابلہ۔ شاگردوں یا حمائتیوں (اب ناقدین) کی فوجیں دونوں طرف صف آرا ہوتی ہیں ایک ہنگامہ رہتا ہے ایک زمانہ تھا کہ یوپی میں کچھ لوگ کہتے تھے کہ جگر اقبال سے بڑا شاعر ہے یہ فلاں سے بڑا یا چھوٹا ہے۔ وہی فلم انڈسٹری کی STAR RATING والا معاملہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میں ایک حلقہ احمد ندیم قاسمی کو اپنا مرشد مانتا ہے لیکن مریدین فیض کی تعداد بہرحال بہت زیادہ ہے۔

فلم انڈسٹری میں عوام کی پسند ناپسند کے علاوہ ذاتی پبلسٹی اور پبلک ریلیشنز

پر بھی لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادب میں یہ پرنسپل پبلسٹی ترقی پسند تحریک کے زمانے سے شروع ہوئی۔ اس سے قبل لکھنے والے زیادہ تر شوقیہ ادیب تھے اور نقادوں کی ایک باقاعدہ جماعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں منشی پریم چند کے علاوہ کوئی بھی پروفیشنل ادیب نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی ادبی تنقید سنجیدہ ہوئی اور طرفدار بھی۔ حلقہ ارباب ذوق پیدا ہوا۔ گھمسان کے رن پڑے۔ ترقی پسندوں نے ایک دوسرے کے متعلق توصیفی کتابچے لکھے ادھر میراجی کا CULT تیار ہوا۔

ہم غریبوں کے مفلس ادب میں تو اس طرح کی پبلسٹی کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا جو مغرب میں ناشرین ایک کتاب لانچ کرنے سے پہلے کرتے ہیں۔ ساٹھ کروڑ آبادی کا ہندوستان۔ دس کروڑ پاکستان کی رکھ لیجئے۔ اس میں ایک ہزار کا ایڈیشن ایک کتاب کا چھپتا ہے! اس کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے طرم جنگ ہو گئے ایک ہزار کے ایڈیشن کے لئے کون ڈھول بجائے گا جو کچھ موافقت یا مخالفت یا چرچا ہوتا ہے وہ ناقدین ہی کر لیتے ہیں۔ قبول عام کی سند محض چند ہزار پڑھنے والوں سے ملتی ہے شاعروں کا آرڈینس البتہ وسیع تر ہے۔ گو ہمارے ہاں۔ یہاں بھی خصوصاً جب سے ادبی انعامات کا سلسلہ شروع ہوا ہے پبلسٹی اینڈ پبلک ریلیشنز کا کام شروع ہو چکا ہے اس سلسلے میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم جیسے باکمال استاد کے ذکر پر جن کو وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ فیض صاحب نے کہا تھا کہ صوفی صاحب سے کم درجے کے شاعر اور رائٹر نے وہ شہرت حاصل کر لی۔ شہرت حاصل کرنے کی کوالٹی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ بعض حضرات خود اس بات کا حساب رکھتے ہیں کہ وہ کتنے مشہور ہیں اور مزید شہرت کے لئے کیا کیا بندوبست کرنا ہے۔ اس کے لئے وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن کا علم و ادب سے تعلق نہیں یہ ایک الگ فن ہے اور صوفی صاحب اس فن سے واقفیت نہیں۔

غالباً ۴۷ء کے لگ بھگ فیض صاحب فوج چھوڑ کر پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر ہو گئے۔ سبط حسن اور بنے بھائی بھی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے پاکستان بھیج دیئے گئے تھے۔ اب لاہور میں ایک بیحد سرخا سرخ فرخ آبادی گروپ جمع ہو گیا۔ نظریاتی کٹرپن اس گروہ کا ایک وصف تھا۔ اسی قسم کا کٹر گروہ اس وقت بمبئی میں جمع تھا۔ ان حضرات میں سے

اب کافی عرصے سے کوئی بھی کٹڑ نہیں رہا۔ لیکن فیض صاحب کی ذہنی پختگی اس چیز سے ظاہر ہوتی ہے کہ جن دنوں یہ سارے ترقی پسند حضرات اقبال کو فسطائی پکارتے تھے۔ محض فیض صاحب اس انتہاپسندی کے مخالف تھے اور اس زمانے میں انہوں نے اقبال ہی کے رنگ میں وہ خوبصورت چیز لکھی تھی۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں پر اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لَے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یہ شمعِ بزمِ صبح کی آمد سے بے خطر

انہی دنوں پہلی مرتبہ فیض صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کراچی میں میرے چچازاد بھائی اور بہن سید سعید حیدر اور بیگم عذرا حیدر کے ہاں آئے ہوئے

تھے میں نے چھوٹتے ہی ان سے نہایت بے دقتی کا سوال کیا۔ فیض صاحب سنا ہے
بنے بھائی آج کل پاکستان میں انڈر گراؤنڈ ہیں کس جگہ انڈر گراؤنڈ ہیں
آپا عذرا ایک نہایت دانشور خاتون ہیں۔ گو میری طرح ان کو بھی شعر یاد نہیں رہتے۔
انہوں نے فیض صاحب سے کہا ——

فیض صاحب وہ کیا عمدہ شعر ہے کہ ؎

جنے کیا جنے کیا جنے کیا
اور جنے کیا جنے کیا جنے کیا

فیض صاحب نے نہایت سنجیدگی سے سر ہلا دیا۔

کراچی میں ہمارے ہاں اور لاہور میں میرے COUSINS. لقمان حیدر اور بیگم لقمان حیدر اور جری احمد سید اور حمیرا سید کے ہاں فیض صاحب کی بڑی دلچسپ محفلیں رہتیں۔ پھر اچانک وہ غائب ہو جاتے۔ یعنی جیل چلے جاتے۔ اسی درویشانہ انداز سے واپس آ کر ان محفلوں میں شامل ہو جاتے۔ فیض صاحب کو کسی نے برافروختہ یا جھلایا ہوا نہیں دیکھا۔

بسلسلہ پنڈی سازش کیس فیض صاحب چار سال قید میں رہے۔ اسی زمانے میں لندن میں ایک بار میں نے ڈان اخبار کی شہ سرخی دیکھی۔ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو پھانسی کی سزا (بڑی خیریت ہوئی کہ بچ گئے) تو سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ وہ شاعر جس کے لئے سچ مچ سزائے موت کی خبریں چھپ رہی ہوں وہ ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

محض رٹا نہیں لکھے گا۔

فیض صاحب کے منفرد اسلوب نے ان کو ڈبلیو ایچ آڈن کی طرح POET'S POET بنایا اور اقبال کے مانند انہوں نے ملکی سیاست میں نمایاں رول ادا کیا۔ بحیثیت انگریزی جرنلسٹ وہ پاکستان کے اہم ترین روزنامے کے ایڈیٹر رہے (پاکستان ٹائمز ہندوستان کے بہترین انگریزی اخباروں کا مقابلہ کر سکتا تھا) مزید برآں پاکستان کی کوئی حکومت فیض صاحب کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ ایک لطیفہ مشہور تھا کہ ہر نئی گورنمنٹ فیض احمد فیض کو INHERIT. کرتی ہے۔ میں نے کراچی اور لاہور میں اعلیٰ حکمرانوں کو فیض صاحب کی

..بار داری کرتے دیکھا ہے جبکہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ شعراء اور ادیب اعلیٰ حکام کی دربارداری کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی فیض صاحب کو سراہا جو ان کی بازو کی سیاست کے مخالف یا خائف تھے۔ ذہن پرست، دانش جو، درسگاہوں کے اساتذہ سرکاری حکام سوسائٹی کی فیشن ایبل بیگمات، ان سب کی فیض صاحب سے ملاقات ایک STATUS SUMBOL قرار پائی۔

مجھے یاد ہے ۱۹۵۶ء میں جب دہلی میں ایشین رائٹرز کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں لاہور سے فیض صاحب اور اعجاز حسین بٹالوی شرکت کے لئے گئے تھے۔ واپس آکر اعجاز نے کہا۔ "فیض صاحب تو کانفرنس میں اسموک کمار بنے ہوئے تھے"۔ فیض صاحب کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہے۔ اس سے سب واقف ہیں۔ سوویت یونین میں ان کی جو آؤ بھگت کی جاتی ہے وہ بچشم خود ملاحظہ کر چکی ہوں۔ ادھر مغرب میں کینیڈا، انگلستان، امریکہ جہاں جہاں اردو داں اور بالخصوص اہل پنجاب آباد ہیں وہ فیض صاحب کے لئے چشم براہ رہتے ہیں۔

تو کیا فیض احمد فیض کی اس ہر دلعزیزی میں ان کا کچھ .PUT ON بھی شامل ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے میں ایک بہت طویل عرصے سے فیض صاحب سے واقف ہوں اور اس دوران میں وہ اہم سے اہم تر اور مقبول سے مقبول تر ہوتے گئے۔ مگر ان کے بڈھا ہڈوا لے انداز میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

موصوف رفتہ رفتہ ایک .CULT FIGURE میں تبدیل ہوتے گئے اور اب ایک نوع کے SAGA بن چکے ہیں۔ ۷۷ء میں ایک کتاب لاہور سے چھپی "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" جس کا عنوان دراصل "ملفوظات حضرت فیض شاہ جہاں دوست" ہونا چاہئے۔ اس میں موصوف کے ایک عقیدت مند نے جو ان کے ذاتی معالج بھی ہیں (نام ان کا ڈاکٹر ایوب مرزا ہے) ان سے مختلف ملاقاتوں میں سوالات کئے ہیں اور ان کا تشفی بخش جواب پایا ہے۔ ان مکالموں سے فیض صاحب کی دھیمی پرسکون شخصیت منکسر المزاجی، حق گوئی، خلوص نیت، شائستگی، شدید حب الوطنی، غمخواری اور دردمندی، شرافتِ نفس حسن مزاج بخوبی آشکار ہوتی ہیں۔ دنیا کے اہم ترین مسائل کو فیض صاحب (جنکو .BOMBAST سے ہمیشہ سے للّٰہی ہے) نہایت سلاست اور نرمی سے حل کر دیتے ہیں مثلاً ایک

فیض کافی دیر خاموش رہنے کے بعد حضرت کہنے لگے "بھئی میں نے تو چین پر تین نظمیں لکھی ہیں۔ روس پر تو ایک بھی نہیں لکھی۔ مجھے یہ چین اور روس کا جھگڑا پسند نہیں۔۔۔۔ روس سمجھتا تھا۔ میں بڑا چودھری ہوں۔۔۔ اب چین بھی محنت اور خود اعتمادی اور SELF RELIANCE. کے تحت بڑا چودھری ہو گیا ہے۔۔۔۔ مسئلہ تو چودھراہٹ کا ہے

مرید: فیض صاحب اتنے بڑے مسئلے کو آپ اتنا سادہ سمجھتے ہیں۔

مرشد: تو بھئی اس میں رکھا ہی کیا ہے۔

مرید: REVSIONISM.

مرشد: لاحول ولاقوۃ بھئی مارکسزم کوئی DOGMA نہیں ہے۔ یہ تو سائنس ہے اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس میں سے جو اصول اور مفروضے تجربے سے غلط ثابت ہوں انہیں REVISE. کرتے رہنا چاہیئے۔

مرید: مزید لکھتا ہے: ایک دن ہم پوچھ بیٹھے۔

فیض صاحب یہ فراڈ ہے۔ کہنے لگے کون سا فراڈ۔ میں نے کہا یہ M.B.E. کا داڈ اور پھر آپ لینن انعام یافتہ بھی ہیں۔

فرمایا بھئی اس میں اُلجھن کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے فوج اسی لئے JOIN کی تھی کہ فاشزم کے خلاف سرگرم عمل ہوں لہٰذا وہاں ہم جو مشورے دیتے تھے وہ انگریز سرکار کو پسند آتے تھے اور وہ اُن پر عمل کرتے تھے اس کے صلے میں انہوں نے کہا بھئی ہم تمہیں M-B-E دیتے ہیں۔ ہم نے کہا دے دو۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ ہم نے تو اسے فاشزم کے خلاف اپنی جدوجہد کی کامیابی تصور کیا۔ بھئی علامہ اقبال کو بھی تو سر کا خطاب ملا تھا وہ اس لئے تو نہیں ملا تھا کہ خاکم بہ دہن وہ انگریزوں کے پٹھو تھے۔

"۔۔۔ میں نے کہا فیض صاحب مسلم لیگ تو ایک قسم کی نوابوں اور جاگیرداروں کی کیچڑ تھی۔ جس میں قائداعظم عوام کی طاقت کے بل بوتے پر پنا کھیتے رہے۔

"فیض کہنے لگے بھئی مسلم لیگ جو تھی اور پھر آزادی کے بعد نااہل قیادت کے ہاتھوں جس انجام کو پہنچی اسے وہاں لامحالہ پہنچنا ہی تھا۔ مگر یہ کیچڑ والی بات نہیں۔۔۔ یہ باقاعدہ ایک سیاسی تحریک تھی ہندوستان میں بہت بڑی اقلیت کے مفادات کے تحفظ کی تحریک۔۔۔

مرید: فیض صاحب جب آپ کو پکا یقین ہو گیا کہ انگریز بہادر ہندوستان کو روس کیخلاف

استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہمیں نیوزی لینڈ آسٹریلیا کی قسم کا ڈومینین اسٹیٹس دینا چاہتا ہے۔
تو پھر آپ کے ذہن پر کیا گزری؟
"کیا گزرتی۔ ہم نے کہا لعنت بھیجو فوج کی نوکری پر جو ہمارے لئے اب بے مقصد ہو چکی تھی۔۔"
چنانچہ فیض صاحب نے دلی سے لاہور آکر چٹرجی ڈائریکٹر ایجوکیشن سے کہا کہ جنگ ختم ہوگئی ہے ہماری استادی لوٹا دو۔
چٹرجی بہت حیران ہوئے کہ بھئی فیض فوج سے باہر آکر کیا کروگے' ا۔ G کے چھلکے تم نے لئے عیش تم نے کئے بنگلہ اردلی تمہارے پاس۔ تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ میں نے کہا ڈھائی ہزار روپے۔
چٹرجی اٹھ کھڑے ہوئے کہنے لگے بھئی اتنی تنخواہ تمہیں فوج سے باہر کہاں ملے گی۔ بھئی میری صلاح یہی ہے۔ کہ فوج سے واپس تعلیم میں مت آؤ۔ ہم نے چٹرجی کو سمجھایا کہ ہمیں بنگلہ وغیرہ نہیں اور ڈھائی ہزار تنخواہ بھی نہیں چاہیئے۔ ہمیں بس صرف پانچ سو روپے ماہانہ مل جائیں تو تقدیر سنور جائے۔"
لیکن لیکچرر کی سب سے اونچی تنخواہ ساڑھے تین سو روپے تھی اس میں گزر کرنا مشکل تھا۔
فیض صاحب دلی واپس گئے اسی زمانے میں میاں افتخار الدین نے ان کو اپنے نئے اخبار پاکستان ٹائمز کے لئے چیف ایڈیٹری کی پیش کش کی اور فیض صاحب واپس لاہور پہنچے۔
ایک مرتبہ اسلام آباد میں فیض صاحب مقیم تھے۔ ایک شام مُرید نے ان سے پوچھا فیض صاحب یہ ہماری ترقی پسند مصنفین کی انجمن کدھر گئی۔ کہنے لگے بھئی عرصہ ہوا۔ ہم تو اس سے الگ ہو گئے تھے۔
مرید نے سوال کیا۔ فیض صاحب ترقی پسند مصنفین کے معترضین نے یہ الزام لگایا کہ یہ انجمن دراصل کمیونسٹ پارٹی کا اگلا بچہ ہے۔
مرشد، بھئی یہ ہرگز نہیں تھا۔ منشی پریم چند کا کمیونسٹ پارٹی سے کیا واسطہ پھر مولانا سالک، مولانا چراغ حسن حسرت مولانا حسرت موہانی کہاں کے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے اس غلط پروپیگنڈے کے دو وجہیں ہیں تقسیم ہند سے قبل انگریز حکومت نے اس انجمن کے بارے میں سب سے پہلے یہ لیبل لگایا تھا۔۔۔ تقسیم ہند کے بعد نوآبادیاتی نظام نے نیا روپ دھار لیا۔۔۔ امریکہ کے ایٹم بم کے خلاف عالمی امن کمیٹی نے ایک اسٹاک ہوم امن اپیل جاری کی یہ اپیل روسی قیادت کے زیر اثر تھی۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے بھی اس امن اپیل پر دستخط کرنے کی ہدایت جاری کی۔۔۔

دوسرے انجمن میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی، کسان کمیٹی ٹریڈ یونین کے لوگ بھی شریک ہو گئے تھے یا انجمن کے ممبروں نے یہ پارٹیاں جوائن کر لیں۔ بھئی مطلبی فرید آبادی بھی تو تھے نا۔ ان لوگوں نے انجمن میں ادب کا REALISM سے COMMITTED SOCIALIST REALISM کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ یہ ہمارے ملک کے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں ممکن نہ تھا۔ ۔ ۔ اگر غربت افلاس اور ناداری کی عکاسی کرتے وقت اس کے منبع کی نشاندہی کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ سرکار برداشت کرے مگر جب آپ اس کا علاج تجویز کرنے لگیں تو رجعت پسند طاقتوں اور حاکم وقت کا حملہ یقینی ہوتا ہے۔ اب اصولاً بات درست ہے اگر آپ بیماری کی تشخیص کر پاتے ہیں تو پھر اس کا علاج تجویز کرنا بد دیانتی ہے اور پھر مجوزہ علاج سے اس بیماری کا قلع قمع نہ کرنا مزید بددیانتی ہے REALISM کی معراج COMMITTED SOCIALISM. ہے لیکن ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا یہ ابتدائی مسلک نہ تھا جیسا کہ اس کے مینی فیسٹو سے عیاں ہے لہٰذا CONFUSION تطہیر اور علیحدگی کی تحریکوں نے زور پکڑ لیا۔

مرید: فیض صاحب یہ تحریک آپ کے خیال میں کامیاب رہی؟

مرشد: بھئی ایک طرح سے تو یہ کامیاب رہی کیونکہ گلشن ادب میں اس تحریک نے ایک نئی طرز فغاں دی۔ دوسرے لحاظ سے اس تحریک کو دھکا لگا وہ ہمارے چند اپنے دوستوں کی وجہ سے۔ بھئی ۱۹۴۹ء میں احمد ندیم قاسمی انجمن کے سیکرٹری تھے حکم ہوا کہ علامہ اقبال کو DEMOLISH. کریں اور عصمت چغتائی منٹو اور ن م راشد کو EX TERMINATE کریں کہ یہ ترقی پسندوں کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ ہمیں یہ بک بک لگی۔ علامہ مرحوم کے ہاں بے پناہ ذخیرہ سامراج، جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف ملتا ہے یہی قصہ منٹو وغیرہ کے ساتھ تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا ہماری ان سے جنگ ہو گئی۔ ہمارا موقف تھا کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کو اس کی .TOTALITY اور عصری تقاضوں کے .PERSPECTIVE میں پرکھا جاتا ہے اور اس کے ادب پارے کے کسی ایک ٹکڑے سے اس کی CONTRIBUTION کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا جائزہ حقائق کے خلاف ہوگا اور باطنی طور پر ضعیف بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر ایک روز منظر علی خاں کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی صفدر میر صدر۔ قاسمی صاحب نے علامہ اقبال کے خلاف ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہمیں بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ ہم نے

اعتراض کیا یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں یہ تو سکہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے ہم بہت دل برداشتہ ہوئے اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے اور صرف پاکستان ٹائمز چلاتے رہے۔" فیض صاحب بقراطی TARGON کو DEMOLISH کرنے میں ہمیشہ سے استاد رہے ہیں چنانچہ ایک روز مرید ایک نقاد کا حوالہ دے کر پوچھتا ہے۔" شعر کیا ہوتا ہے اور اچھے شعر کی تعریف کیا ہو سکتی ہے"؟ کہنے لگے بھئی شعر شعر ہوتا ہے اور شعر لکھنے کے عمل کو شاعری کہتے ہیں۔ شعر کسے کہتے ہیں یہ یار لوگوں نے خواہ مخواہ کا سوال کھڑا کر دیا ہے۔ اگر فاطمی صاحب کا شعر کی تعریف سے مدعا بحر وزن ردیف قافیہ اور تقطیع قسم کی کوئی چیز ہے تو بھئی مجھے تو خود تقطیع ٹھیک سے نہیں آتی اور جب ہم شعر کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں تقطیع وغیرہ کا ہرگز خیال نہیں ہوتا...

فیض صاحب عربی کے ایم اے ہیں۔ جیل میں درس قرآن و حدیث بھی دے چکے ہیں۔ اور صوفیائے کرام کی تصانیف پڑھا چکے ہیں اور ایک مرتبہ ایک عرس میں جا پہنچے جہاں آپ کی دستار بندی بھی کی گئی۔ موصوف دراصل صوفیائے کرام کو" اصل کا مریڈ لوگ" سمجھتے ہیں جنہوں نے" بھید پالیا تھا"

فیض صاحب نے ایک مرتبہ کالج کے مشاعرے میں نظم پڑھی علامہ اقبال نے بلا کر بہت شاباش دی اس واقعے کے متعلق مرید نے پوچھا آپ کے خیال میں علامہ اقبال کا شاعری میں کیا مرتبہ ہے۔ فرمایا جہاں تک شاعری میں SENSIBILITY زبان پر عبور اور غنائیت کا تعلق ہے ہم تو ان کے خاک پا بھی نہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر ہیں پھر کہتے ہیں اگر علامہ سوشلزم کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا۔

مرید نے پوچھا آپ نے غالب سے رنگ تغزل اقبال سے غنائیت لی ہے اور دونوں میں اپنا سوشلزم مکس کر دیا ہے۔ مسکرائے اور کہا بھئی اس سے کسے انکار ہے۔

فیض صاحب لندن میں تھے اور پاکستان میں جنرل ایوب خاں نے مارشل لاء لگا دیا۔ آرام سے لندن میں رہ سکتے تھے۔ مارے حب الوطنی کے پاکستان پہنچے اور پکڑے گئے۔ فرمایا" بھئی اس مرتبہ جیل میں عجیب تجربہ ہوا وہ شروع ہی سے اکتاہٹ کا تھا۔ ہم تنگ آچکے تھے جب دیکھو وجہ بلاوجہ ملک میں کچھ ہو ہم جیل خانے میں۔ آخر یہ کیا ترکیب ہے ہم کوئی چور ہیں ڈاکو ہیں، کوئی قتل کیا ہے ملک کے خلاف کچھ لکھا ہے ..."

پھر جنرل یحیٰی کے مارشل لاء کا زمانہ آیا مرید و مرشد دونوں پھر لندن میں موجود تھے" معلوم ہوا

ہم لوگ پھر اندر ہونے والے ہیں ۔ فہرست تیار ہو چکی ہے ہم نے اپنے دل کو تسلی دی کہ چلئے لندن سے لاہور قلعے تک ہو آئیں " فیض صاحب مسکرا رہے تھے کہ بھئی کم ازکم ہمارے معاملے میں بس کر دینی چاہیئے آزمائش ایک مرتبہ ہوتی ہے۔ دو دفعہ بھی چلتے ٹھیک ہے ۔ مگر یہاں جب بھی تخت الٹتے ہیں ہماری آزمائش کی گھڑی خواہ مخواہ آجاتی ہے ہم نے کچھ کیا ہو پھر بھی بات سمجھ میں آئے ۔ بیٹھے بٹھائے دھر لئے جاتے ہیں ۔ بھئی ہم تو تخت نہیں گراتے ہم تو تاج نہیں اچھالتے ۔ ہم تو صرف کہتے ہیں کہ یوں ہو جائے یا ہم یوں کر دیں گے "

چنانچہ فیض صاحب لندن سے کراچی پہنچے اور پھر جیل میں ہیں وہی گوشۂ قفس ہے وہی فصل گل کا ماتم پھر مزید کہتا ہے کہ فیض صاحب کو عمر کے اس حصہ میں زیادہ دکھ اور قلق محض اسی بات سے ہے کہ " اب دیوانے غائب ہو چکے ہیں ۔ غائب نہیں بلکہ ہوشیار ہو گئے ہیں ۔ وارفتگی جنوں میں گھر پھونک کر دشت نوردی کے لئے اب دیوانے نہیں نکلتے اب تو در و بام سجا کر ڈرائنگ روم میں حسن و مستی کی باتیں کرتے ہیں "

یہ بات کس قدر صحیح ہے !

ملفوظات حضرت فیض شاہ جہاں دوست پڑھتے ہوئے راقم الحروف کو وہ سب زمانے یاد آئے جب حضرت کی اچانک گرفتاری کی خبر سن کر ہم سب اداس ہو جاتے تھے اور بے حد تعجب ہوتا تھا ۔ آخر فیض صاحب اس قدر مرنجاں مرنج شرمیلے قسم کے انسان جو اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتے اتنے خطرناک انقلابی کس طرح ہیں کہ ان کو آئے دن پکڑ کر بند کر دیا جاتا ہے ایک نوعمر بوجھ بجھکڑ کزن نے سر ہلا کر کہا آہا اب سمجھ میں آیا یہ فیض صاحب جو ہیں یہ پولیس والوں سے ملے ہوئے ہیں ان سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً جیل بھیج دیا کرو تاکہ وہاں کی صعوبتیں اٹھا کر بڑھیا شاعری کروں ۔ آپ ہی سوچئے ؎

سرفروشی کے انداز بدلے گئے دعوئے قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فرازِ دار و رسن سے پہلے

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

رفیق راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چھٹا یہ ساتھ تو راہ کی تلاش بھی نہ رہی
ملول تھا دلِ آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا، اِک خراش بھی نہ رہی

جیسی خوبصورت شاعری فیض صاحب کے علاوہ اور کون کر سکتا تھا؟
تو کیا ہر سعدی کے لئے یورش تاتار ضروری ہے؟

فیض صاحب کا اثر ان کے متعدد معاصر شعرا پر بہت گہرا اور واضح ہے علاوہ ازیں شیشوں کا مسیحا۔ درد کا رشتہ۔ ہم تاریک راہوں میں مارے گئے۔ میرے ہمدم مرے دوست یہ داغ داغ اجالا۔ نثار میں تری گلیوں پہ۔ متاعِ لوح و قلم۔ چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔ موسم گُل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو۔ درد بجھیں گے گیت گائیں گے۔ ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے۔ نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا۔ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔ گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔ دشت تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں۔ درد آئے گا دبے پاؤں لئے سرخ چراغ۔ پرورش لوح و قلم۔ مجھ سے پہلی سی محبت۔ آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ۔ آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم، وغیرہ وغیرہ اب تک ادبی کلیشے بن چکے ہیں۔ خود میں نے سب سے پہلے یہ داغ داغ اجالا کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا۔ امروز میں چھپا پھر جب کبھی فیض صاحب لاہور سے تشریف لاتے میں کہتی آپ نے اپنا ہوم ورک کیا؟ کوئی ایسا شعر کہا ہے جسے میں ناول کا عنوان بنا لوں؟ پھر میں نے سفینۂ غم دل اڑایا۔ چند سال بعد "آخر شب کے ہمسفر"۔ اپنی گھریلو میوزک پارٹیوں میں، ڈھل چکی شام بکھرتے لگا یندوں کا غبار، کیدارا میں الاپ کر ہم محفل ختم کرتے۔ یہ باقاعدہ ایک RITUAL تھا اس پہ یاد آیا کہ فیض صاحب اس لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت ہیں ان کے کلام کو سُروں میں ڈھالنے کے لئے مہدی حسن، نورجہاں،

فریدہ خانم، ملکہ پکھراج اور نیرہ نور جیسی آوازیں ملیں ۔فیض صاحب کے ہاں "شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارہ شام" یہاں سے شہر کو دیکھو اور زرد پتوں کا بن جو میرا دیس ہے ۔سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر" کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی کمی نہیں ہے

راستے بجھ گئے رخصت ہوئے راہ گیر تمام
اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند

زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
دل میں اب یوں ترے بھولے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو!
سوئے میخانہ سفیران حرم آتے ہیں
ایک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں۔

اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہ سوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہوگا

فیض صاحب زبان کے معاملے میں اُس اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں وہ اطمینان سے "خوشبوئے خونش کناراں اور"بادبان کشتی صہبا" کے ساتھ ساتھ "پوسٹ مینوں کے نام" بھی لکھتے چلے جاتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ فیض صاحب نے ایک فلم "جاگو ہوا سویرا" بھی بنائی تھی۔ جس نے ایوارڈ حاصل کیے اور باکس آفس پر فیل ہوئی۔

پاکستان کے مشہور صحافی ایوب احمد کرمانی کی ٹریجک موت پر فیض صاحب نے ایک انتہائی خوبصورت مرثیہ لکھا

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

محض یہ ایک غزل فیض صاحب کے اسٹائل اور ڈکشن کی مکمل عکاسی کرتی ہے لیکن فیض کی شاعری کی مخصوص فضا اور ڈیکورکو انگریزی میں منتقل کرنا بہت مشکل ہے ڈکٹر کیرنن کلام فیض کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں اس سے قبل راقم الحروف نے کیمرج کی ایک POETRY READING. کی محفل میں پڑھنے کے لئے دست صبا کی متعدد نظموں کا ترجمہ کیا تھا جو افسوس کہ لندن واپس آتے ہوئے ٹرین میں رہ گیا۔ لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اُردو شاعری کا انگریزی میں کامیاب ترجمہ تقریباً ناممکن ہے ۔

فیض صاحب آرم چیئر سوشلسٹ کبھی نہیں رہے وہ اپنے بے حد متمول والد کی خریدی ہوئی زمینیں اپنے غریب رشتہ داروں کو بانٹ چکے ہیں اور لسلسلہ دلیش بھگتی انہوں نے جو کچھ جھیلا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ لیلائے وطن کی چاہت میں ہمیشہ دشت نوردی کرتے رہے ہیں۔

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعان میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

فیض صاحب آخری دم تک ایسی چیزیں لکھتے رہے ہیں جیسے بنے بھائی کا مرثیہ

خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسند پیر مغاں ہے

اور فلسطینی بچے کی لوری

مت رو بچے
تیرے آنگن میں
مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندر ما دفنا کے گئے ہیں

فیض صاحب کی شاعری کبھی کمہلا نہیں سکتی۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے آج کے فلسطین اور ایران دالجیریا کا شاعر پہچان سکتا ہے۔ میر غالب اور اقبال بھی اس کو پسند کرتے اور پنجاب کے بلھے شاہ اور بابا فرید بھی۔

آغا سہیل

فیض کی شاعری کا زندہ لفظ [صدا]

شاعری میں زندہ لفظ لکھنے والا آفاقی شاعر وہی ہوتا ہے جو بیدار ذہن اور وسیع تر ذہنی اُفق کے ساتھ کائنات کے تمام انسانوں، بالخصوص مظلوم انسانوں کے درد کو دِل سوزی اور خلوص سے محسوس کرتا ہے اور ان کی ترجمانی آپ بیتی کے انداز میں کرتا ہے اگر بفرضِ محال تھوڑے عرصے کے لئے وہ رومانوی نقطۂ نظر سے احساس اور وجدان اور جذبے سے رجوع بھی کرتا ہے تو اس میں بھی تخیّل کی تہہ میں سوجھ بوجھ، ذہانت اور شعور کی پختہ رو موجود ہوتی ہے جو سطور میں گم ہو تو بین السطور میں ظاہر ہوتی رہتی ہے اور اس صورت میں احساس کی ایک نئی جہت سامنے آتی ہے جسے احساس کی نشاۃ الثانیہ تو کہا جا سکتا ہے جس میں **شعور کی رو کار فرما** رہتی ہے اور نظام تفکر و تعقّل مسلسل ارتقاء پذیر رہتا ہے گویا نظریہ عقلیت اور اصول پرستی کی طرف اس کا قبلہ قائم رہتا ہے لیکن اسے گم کردہ راہ رومانویت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

فیض کی شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں آج کل بعض نقادوں نے جو دُھند مچائی ہے اور الٹی سیدھی توجیہیں کرنا شروع کی ہیں اُن کی شاعری کے مفاہیم کے تعین میں جو جو شُتقلے چھوڑے جا رہے ہیں ان سے ان نقادوں کی کم سوادی پر ایک طرف تو ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے دوسری طرف اُن کی چالاکیوں اور ستم ظریفیوں کا بھانڈا پھوڑنے کو جی چاہتا ہے۔ ان نام نہاد نقادوں نے فیض کے مرتے ہی فیض کو رومانی شاعر ٹھہرانے کے لئے فیض کی شاعری میں "فرد" کو دریافت کر کے فیض کی انفرادیت پسندی کی تان رومانیت

صدا کا ترجمہ پروفیسر کرار حسین نے ایک تقریر میں زندہ لفظ کیا ہے۔

پر جاکر توڑی ہے جس میں شیلیگل، شیلنگ، وارٹن، ہرڈل اور مادام دی اسٹیل وغیرہ کے لاطائل اور فضول حوالے دے دے کر قارئین کو مرعوب کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے اور روسو کے حوالے سے سیدھے سادے قارئین کو یہ کہہ کر بہکانے کی کوشش کی ہے کہ رومانوی تحریک کے زیر اثر ۱۷۸۹ء کا فرانس کا سیاسی انقلاب برپا ہوا۔ اصل میں یہ وہی چکر ہے جس کے تحت استعماریت ترسیل اور ابلاغ کے راستے میں موانع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ نصب العین کو گم کر کے فضول اور فالتو چیزوں کے تصورات اور احساسات میں پھنسا کر دانشوروں کو بہکاتی ہے تاکہ اس کے پردے میں ان کا استحصال جاری رہ سکے۔ غالب۔ حالی۔ حسرت اور اقبال کے بعد فیض سب سے زیادہ واضح نصب العین کا شاعر ہے جس کے بارے میں نہ ابہام ہے نہ گنجلک اور کوئی شک و شبہ۔ روسو کے حوالے سے جس انقلاب کی بات کی جاتی ہے وہ صاف صاف بہکانے اور جھٹکانے والی بات ہے اب کسی جھانسے میں کم از کم باشعور قاری نہیں آسکتا۔ جس انقلاب کی روسو کے حوالے سے بات کی جاتی ہے اس روسو کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں۔

"روسو نے جذبے کے مقام کو عقل کے مقام سے بھی اونچا قرار دیا ہے اس کے نزدیک انسانیت کے درد کا مداوا دل کی تہذیب میں مضمر ہے نہ کہ دماغ کی۔ اس نے مذہب و اخلاق کو بھی جذبے کے تحت وابستہ کر دیا ہے جس کی بنیاد منطقی تجزیہ نہیں بلکہ یقین ہے"

فیض نے کسی ماورائی جذبے کی بات نہیں کی ان کے ہر تخیل کی اساس ہی ارضیت ہے۔ یہ بات بجائے خود مضحکہ خیز ہے کہ فیض کی شاعری کی شرح تحسین ناشناسی کے مترادف کی جارہی ہے اور جو لوگ بزعم خویش اور بقلم خود یہ باتیں کر رہے ہیں وہ صحیح معنیٰ میں فکری سطح پر فیض کی شاعری کی شکل و صورت کو مسخ کر رہے ہیں کیونکہ جس رومانویت کے حوالے سے فیض کی تفہیم کرائی جارہی ہے وہ باقاعدہ ایک سازش ہے کہ اردو ادب میں حقیقت یہ ہے کہ رومانویت کبھی باقاعدہ تحریک کی شکل میں کبھی نہیں پائی گئی اور بقول شخصے ہمارے یہاں تو مصنوعی کلاسیکیت PSEUDO CLASSICISM کا کوئی پس منظر بھی موجود نہ تھا جو انگلستان میں پروان چڑھا۔ یہ ضرور ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں آزادی کی خواہش بہتر سے فنکاروں کے فن پاروں میں ملتی ہے لیکن ترقی پسند تحریک نے جن لوگوں کے لئے فکری راستہ

ہموار کی ان کے بیان اور طرزِ نگارش میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں انہوں نے ادب اور معاشرے کے رشتوں کو ہر سطح پر بخوبی سمجھا اور سمجھایا! اور ادب اور ادیب کے کردار کا تعین بھی کیا۔

ترقی پسندوں نے گم کردہ راہ رومانویت کو کبھی قبول نہیں کیا مجنوں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ہیوگو رومانوی تحریک کا جو مردہ پرستی کے خلاف پہلی بغاوت تھی، صدر، اس کا آمر، اس کا شہنشاہ، اس کا کاہن اعظم اس کا الہامی شاعر، اس کا پیغمبر اس کا خدا غرضکہ اس کا سب کچھ تھا اس کا ڈراما ہرنانی گویا رومانویت کا پہلا صحیفہ آسمانی تھا۔ رومانویت کی فتح کا یہ پہلا اعلان تھا۔ ہر طرف سے واہ واہ ہو رہی تھی ۔ حاضرین کی نگاہیں رومان کے اس نئے حکمران پر جمی ہوئی تھیں۔"

اس طرح یہ جو ایک لہر اٹھی تھی وہ غائب ہونا شروع ہوگئی، پروفیسر احتشام حسین نے اسی باب میں ایک جگہ یوں لکھا ہے۔

"بیسویں صدی کے آتے آتے آزادی کی خواہش اور مغربی اثرات نے عمل کی دنیا سے دور ایک انتہا پسندانہ رومانوی اور تخیلی انداز نظر پیدا کر دیا تھا جو کسی کے یہاں مذہب سے بغاوت کی شکل میں کسی کے یہاں تخیلی رنگین بیانی اور والہانہ گمشدگی کے رنگ میں رونما تھی جو زنجیریں واقعی زندگی میں نہیں ٹوٹ سکتی تھیں وہ خیالوں میں ٹوٹنے لگیں اور تصور کی مینا کاریوں سے محدود زندگی ہی میں نئے چمن کھلنے لگے۔"

مگر اس دور کو ترقی پسند تحریک نے ختم کر کے واضح نصب العین پیدا کیا اور تمام اقدار کا واضح تعین منضبط شکل میں کیا، فیض ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو شعور حاصل کرتے ہیں اس میں کسی قسم کے ابہام کی گنجائش نہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں وضاحت اور صراحت، موجود ہے غزلوں کے بین السطور ایک ارتقاء پذیر شعور کی رو مسلسل ملتی ہے اور نظموں میں واضح طور پر اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔

فیض نے معاشرے کے تمام عوامل اور اقدار کا سائنٹفک تجزیہ کیا اور اس کے

لئے انہوں نے معروضی رویہ اختیار کیا، جس طرح غالب کا ذہنی اُفق کلکتے کے سفر کے بعد وسیع ہوا اور انہوں نے معاشرے کے مادی اور جدلیاتی اقدار کی صحت مند خطوط پر تفہیم کی بالکل اسی طرح فیض نے ترقی پسند تحریک سے استفادہ کیا چنانچہ اس خیال کو بار بار تقویت پہنچتی ہے کہ فیض نے ادب اور زندگی کے رشتے کے تعین کے لئے گہرے مشاہدے اور سائنٹفک تجزیئے سے کام لے کر انتہائی خلوص اور دِل سوزی سے شعر کہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ فیض کی دِلکشی میں کلاسیکی رنگ ہے، بجائے خود فیض کی رومان پسندی سے متعلق نہیں بلکہ یہ ان کی زندگی کا ایک انفرادی واقعہ اور مذاق سلیم کا ایک تقاضہ ہے نیز فیض کے معرب اور مفرس رویئے کا غماز ہے جس میں مُہند رویئے کی گنجائش نہ تھی اس حساب سے فیض کو غالب اور اقبال کے قبیلے کا شاعر سمجھنے میں کیا حرج ہے نیز شمالی ہند میں اہل پنجاب کے لِسانی مذاق میں کلاسیکی دِلکشی کا رچاؤ سوسائٹی کے اہل علم کا پسندیدہ طُغرائے امتیاز تھا، لطف یہ ہے کہ معرب اور مفرس لغات کے باوجود فیض کی غزل جدید دور کے معاشرے سے کلام کرتی ہے اور آفاقی اقدار سے مملو نظر آتی ہے اور یہی فیض کا زندہ لفظ بنتی ہے۔

فیض ایک سنجیدہ متین اور متدین شخصیت کے حامل تھے اور قید و بند کی صعوبتوں سے گزر کر انہیں صرف سرد و گرم چشیدہ ہی نہیں کہا جا سکتا بلکہ دار و رسن سے ہزار ہا بار وہ گزرے یہ درست ہے کہ دار کی خشک ٹہنی پر فیض نہیں لٹکے، لیکن لٹکنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی اور اس طرح سینکڑوں بار وہ اس تجربے کی گرمی اور حرارت سے دوچار ہوئے، گویا شاعر کی حیثیت سے کئی بار دار پر لٹکے، علاوہ ازیں اُن کے قبیلے[ص۱] کے متعدد افراد دار و رسن کے تجربے سے گزرے اور خود فیض نے آخر دم تک بیروت کے محاذ پر زندگی اور موت کو قریب سے دیکھا۔ کربلائے بیروت کے چرکے سہے اور

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

کا لطف اُٹھایا۔

فیض کی نظموں اور غزلوں کا انداز یہ ہے کہ زخم ایک ہے دہانِ زخم جُدا جُدا ہیں جو واردات اُن پر گزرتی ہے وہ کل آفاق و انفاس کے آشوب کا نوحہ ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ محض درد مند دِل کی بات نہیں، احساس، ادراک شعور و آگہی کا کرشمہ بھی ہے،

ص۱ قبیلے سے مراد ہے ؏ کے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

اگر روشنیٔ طبع ہی نہ ہو تو احساس و ادراک کہاں، چنانچہ اس بصیرت اور آگہی کے لئے تمام سماجی اور معاشرتی علوم سے واقفیت ضروری ہے۔ تاریخی تسلسل میں روایات کی کڑیوں کو ملاکر جن اقدار کا تعین ہوتا ہے انہیں صحت مند خطوط پر استوار کرنا محض عمرانی علماء کا کام ہوتا ہے جو ردو قبول سے گزر کر اجتہاد کرتے ہیں۔ فیض اس مرحلے سے بھی گزرے اور صحیح سلامت گزرے، دل پر خواہ کچھ بھی گزر گئی لیکن شعور کی اس رَو کو بچا کر لے آئے اور اس سے اپنے ایوانِ تخیل کے شیش محل کو سجا کر جو روشنی کی اس سے محنت کشوں کی کٹیا بھی جگمگائی اور علماء کی جھونپڑی میں بھی اجالا ہوا۔ یہ ایک امانت تھی جو مسلسل حالتِ سفر میں ہے اور اسے سنبھالنے اور اس کے وارثوں تک پہنچانے کا کام ہر دور میں ہوتا ہے لیکن جو اسے سنبھالتے ہیں وہ خود بڑی مشکل سے سنبھلتے ہیں۔

غالب نے ۱۸۵۷ء میں چرکے تو سہے لیکن ان کے پاس وراثت کوئی نہ تھی، میر نے نادر شاہ، سورج مل جاٹ اور احمد شاہ ابدالی کے زمانوں کی قتل و غارت گری دیکھی اور دلی اور دل کے مرثیے بھی لکھے، میر و غالب دونوں بڑے شاعر تھے لیکن دونوں اپنے اپنے انداز کے نوحہ خواں و نوحہ گر ہیں۔ وراثت ان دونوں میں سے کسی کے پاس نہ تھی دونوں نوحہ گر بھی ہیں نوحہ خواں بھی اور مبصر بھی لیکن وراثت اور امانت دونوں کے پاس نہ تھی فیض نے پرکھوں سے جو کچھ لیا اسے اپنی ذات میں سمو یا اور اپنے شعور کی رُو سے اُسے جگمگایا اور آنے والی نسلوں تک منتقل کر دیا۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میرؔ و غالبؔ فیض سے چھوٹے شاعر ہیں میرؔ و غالب کا قامت تو شاید فیض سے بلند تر ہے مگر وہ متاعِ شاعری میں بڑے ہیں مگر فیض کی نگاہ محض ماضی اور حال پر نہیں مستقبل پر بھی ہے غالب بھی یہ احساس رکھتے ہیں کہ ان کے کلام کی شہرت ان کے بعد تمام روئے ارض پر پھیل جائے گی، فیض تو یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے انہیں تو انکساری کے حصار سے نکلنا ہی ملا، لیکن اس کے باوجود ان کے تخیل کی توانائی میں جو بصیرت اور شعور جذب ہوا ہے اُس نے ان سے زندہ لفظ لکھوایا۔ میرؔ غالبؔ اور فیضؔ کے کردار کا بغور مطالعہ کیجئے تو زندہ لفظ لکھنے والے کی قدر ہوتی ہے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانوں کے آشوب سے گزرا ہے لیکن ہر ایک اپنی جانِ عزیز کو بچانے کی فکر میں رہا۔ فیض وہ واحد شاعر ہے جس نے موت کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی زندگی کے ماہ و سال موت کی

قربت اور دار کی حرارت میں گزرے نیز انہوں نے بیروت میں بہت قریب سے حق و باطل کا معرکہ دیکھا۔ میرؔ تو سورج مل جاٹ کو اپنا مربی سمجھتے رہے غالبؔ نے انگریزوں کے قصیدے لکھے لیکن فیضؔ نے تو مرتے مرتے بھی اور مرنے کے بعد بھی ظالموں سے سمجھوتے نہ کیئے لہٰذا وہ اس بار امانت کو سنبھال کر نار نمرود (کربلائے بیروت) سے نکل آئے اور زندہ رہے اسی لئے زندہ لفظ لکھنے کے اہل ٹھہرے۔

کرو کج جبیں پہ سر کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

یہی وہ وراثت ہے اور امانت ہے جو ہمارے زمانے کو منتقل ہوئی ہے جو نمرود و یزید کو بھی کھٹکتی تھی اور آج کے یزیدوں اور نمرودوں کو بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی، انفس و آفاق میں اسی کجکلاہی کا ذکر زندہ ہے جو ابراہیمؑ اور حسینؑ نے زندہ کی اور سنت منصور بھی یہی ہے اسی امانت اور وراثت کو پرآشوب زمانوں میں سنبھالنے اور سنبھال کر اس کے ورثاء کے حوالے کرنے والے دانشور زندہ لفظ لکھتے رہے ہیں۔

جیلانی کامران

ہمارا فیض

اردو ادب اور خاص طور پر شاعری پر ایسا زمانہ شاید پہلے کبھی نہیں آیا تھا جیسا زمانہ فیض کی زندگی کے دوران ادب اور شاعری پر آیا تھا۔ فیض کو اپنانے والے بھی موجود تھے اور فیض کو رد کرنے والوں کی آواز بھی بے حد بلند تھی اور دونوں کے درمیان فیض نے اپنی شاعری کا بالغ ترین دور بسر کیا۔ اور اپنی آواز کو اپنے مخصوص لہجے میں بولنے کی قوتوں سے آشنا رکھا اس طرح برابر یہ تاثر دیا کہ زمانے کے بطن میں واقعی کوئی شے داغدار ہے۔ جسے زمانہ قبول نہیں کرتا گزشتہ پچیس برسوں کے دوران اگر اخباروں کے تراشے جمع کئے جائیں اور فیض کے بارے میں آئے عام کو اخباروں کے رویوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ضرور معلوم ہو گا کہ فیض ہمارا شاعر نہیں ہے اس کا اس ملک کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے جسے پاکستان کہا جاتا ہے۔ اور وہ اس اعتبار سے اپنے ہی ملک کا ہمدرد نہیں ہے۔ اور اس طرح یہ سوال عموماً ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ اگر فیض ہمارا شاعر نہیں ہے تو کن کا شاعر ہے؟ اور اگر اس کا وطن پاکستان نہیں ہے تو اس کا وطن کہاں ہے؟ غیر سنجیدہ جرنلزم نے فیض کو تہذیبی جلاوطنی کا مرتکب تو قرار دیا۔ لیکن اسے کسی جغرافیے میں آباد کرنے کی کبھی نشاندہی نہیں کی۔ ادبی تنقید نے اپنی محدود روشنی میں فیض کی تخلیقی زندگی کے گراف کو جامد قرار دیا اور کہا کہ فیض رومان اور ترقی پسندی کے اجزا کو مربوط کرنے کی سعی میں اپنے شعری ارتقا کو متاثر کر چکا ہے۔ اس لئے اس کی آواز صدائے عہدِ گزشتہ ہے۔ تاہم ایسے سارے رویئے فیض کی زندگی کے دوران ظاہر ہوتے رہے اور فیض کے بارے میں ملے جلے رشتے برابر موجود رہے۔ لیکن فیض کے رخصت ہوتے ہی (۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء) سارے حجاب باقی نہ رہے اور نہ فریقوں کی تقسیم ہی قائم رہی۔ اور سب نے یکزبان ہو کر کہا کہ فیض ہمارا ہے... پاکستان کا ہے اور ہماری شعری روایت کا قابلِ فخر شاعر ہے...

رویوں کے جس نقشے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ذہنی معیار بسا اوقات کتنی غلط اطلاع فراہم کرتے ہیں اور ہماری ذہانت کا میزان کس قدر کم ہے۔

غالباً ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہم تخلیقی فکر کو پہچاننے سے قاصر ہیں اور ہر تخلیقی فکر کو اپنے عہد کی ضرورتوں کے حوالے سے ناپتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ تخلیقی فکر اور عہد حاضر عموماً ایک دوسرے کے متوازی ہوتے ہیں۔ اور یوں ان کو ایک دوسرے کا عکس کہنا بھی درست نہیں ہے۔ عہد حاضر جن اجزا سے صورت پاتا ہے اور جن حکمران قوتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ عموماً وہ اجزا نہ تو تاریخی طور پر مرکزی نوعیت کے اجزا ہوتے ہیں اور نہ حکمران قوتیں ہی اپنے عہد کے اصل رجحان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عہد حاضر کا مرکزی شخص عموماً مخفی رہتا ہے اور اسے صرف تخلیقی تجربہ ہی آشکار کرتا ہے۔ عہد حاضر کی پہچان اپنے عہد کے قلبی اور ذہنی رویّوں سے ہوتی ہے۔ اور قلب و ذہن کے بے شمار چہروں میں اصل چہرے کی پہچان بھی کم آسان نہیں ہے۔ غالباً اسی دشواری کے پیش نظر جب فیض کی عظمت کا تذکرہ ہوا تو سب نے ایک ہی جملہ دہرایا کہ فیض نے غزل کی زبان کو نئے معانی دیئے ہیں۔ فیض غزل کو ایک نئے لہجے سے آشنا کرتا ہے۔ پروفیسر کرار حسین نے ترقی پسندوں ہی کی پکار کو دہراتے ہوئے کہا ہے کہ فیض مظلوم عوام کو قافلے کی صورت میں منزل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

(۲)

فیض کی تربیت نہ تو غزل نے کی تھی اور نہ ترقی پسند تحریک ہی نے فیض کو راستہ دکھایا۔ فیض کی تربیت در اصل نئے علوم نے اور مغربی نصاب تعلیم نے کی تھی۔ کالج دگورنمنٹ کالج لاہور) کے زمانے میں ادب اور شاعری کے جمالیاتی رویّوں نے فیض کو زبان کی جمالیات سے آگاہ کیا۔ اور ایسے شاعروں سے آشنا کیا جو انسان کو ایک نئی دنیا میں آباد کرنے کے آرزومند تھے۔ جس زمانے میں فیض ادب کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تھے وہ زمانہ ہماری اعلیٰ درسگاہوں میں رومانوی تحریک کے انگریز شاعروں کا زمانہ تھا۔ اور اسی زمانے میں آئرش رپبلک بھی قائم ہوئی تھی اور آئرلینڈ کی ادبی تحریک کا چرچا بھی عام ہوا تھا۔ ان بڑے بڑے خد و خال کو دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ فیض کی شاعری کا انسانی تصور نئے علوم اور انگریزی ادب کے نصاب تعلیم سے وابستہ ہے۔ انسان کی حیات ارضی کے بارے میں فیض کی تربیت نئے علوم اور انگریزی ادب نے کی تھی۔ اسی زمانے میں جب فیض گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالے "راوی" کے ایڈیٹر تھے، مغربی یورپ کے ممتاز ادبی دانشور انقلابِ روس سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے انقلابِ روس کو نئے انسان کے ظہور سے منسوب کیا تھا۔ فیض کی شاعری کا مزاج اس نئے انسان سے تعلق

رکھتا ہے اور اس انسان کی شناخت نئے علوم کی تدریس سے تعلق رکھتی ہے۔ انگریزی ادب کی تدریس اس اعتبار سے قابل غور بھی ہے کہ یہ ادب نوعمر ذہن کو شدت کے ساتھ بیدار کرتا ہے اور انسان کے حق میں نوعمر ذہن کے دلی محسوسات کو بدلا ہوا رخ فراہم کرتا ہے اور اگر اقبال کی یہ بات درست ہے کہ مسلمان کو مسلماں تہذیب مغرب نے کیا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فیض کو انسان کے ساتھ آگاہ کرنے کی تمام تر کوشش نئے علوم اور انگریزی ادب کی ہے تاھم ذہنی تربیت کے اس عمل میں فارسی شاعری، اور گھرانے کی دینی تعلیمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اوائل جوانی میں فیض کے مذہبی رجحان کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے ــــ... فیض کی جس تربیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انسانی کردار کی تشکیل کو نمایاں کرتی ہے۔ اور فیض کی شخصیت میں اپنے عہد کے جدید مسلمان ذہن کی نشاندہی کرتی ہے! برصغیر کے مسلم کلچر کے لئے ایسا جدید ذہن اس زمانے میں مسلمان معاشرے کی کامیابیوں میں شمار ہوتا تھا۔

جس عہد کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ دکھائی دی ہے کہ اس عہد کا نوعمر ذہن اپنی زندگی کو مفہوم دینے کا شدت کے ساتھ آرزومند تھا۔ اور انفرادی زندگی کا مفہوم اجتماعی انسانی زندگی کے ساتھ رشتہ قائم کرنے سے پیدا ہوتا تھا۔ فیض کا عہد زندگی میں کچھ نہ کچھ کرنے کا خواہشمند تھا۔ اور اسی میں اپنی انفرادی زندگی کا جواز تلاش کرتا تھا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو نہ تحریک آزادی نمایاں ہوتی، نہ ادب کی تاریخ میں اعلیٰ پائے کے تخلیقی ذہن ظاہر ہوتے اور نہ خواجہ خورشید انور کے انقلابی ذہن سے اعلیٰ خصوصیت کا موسیقار رونما ہوتا۔ فیض کی زندگی کو ایسے معروضی جواز کے حوالے سے دیکھنا بے حد ضروری ہے۔ فیض نے انسان کے حوالے سے اپنا معروضی جواز فراہم کیا ہے۔

(۳)

میں نے فیض کے بارے میں جو نظر انداز اختیار کیا ہے اس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ میں فیض کی ادبی شہرت کو اس طرح بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جیسے تعریف اور مدح کے لئے واقعات کو مرتب کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ ایک حقیقت ہے کہ ادبی شہرت کا تجزیہ جن اصولوں کے تحت ممکن ہو سکتا ہے اسے کسی بھی نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ تاہم فیض نے جس عہد میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا وہ عہد نظم کا تھا۔ اور نظم غیر جذباتی طریق اظہار کی نمائندہ ہوتے ہوئے غزل سے الگ اپنی صورت اختیار کر چکی تھی۔ راشد، میرا جی، یوسف ظفر

۱؎ اس کا ذکر خود فیض نے کیا ہے (متاع لوح و قلم)

اور قصہ تق حسین خالد کی نظم واضح طور پر غیر جذباتی تھی اور اس میں محسوسات کی بجائے عقل و خرد کے رویئے کار فرما دکھائی دیتے تھے۔ ان نئے لکھنے والوں کے برعکس اختر شیرانی کی نظم میں محسوسات کی آمدورفت بخوبی دکھائی دیتی تھی۔ فیض نے اپنی نظم کا آغاز اس شعری آب و ہوا میں کیا جسے اختر شیرانی کی نظم نے پیدا کیا تھا۔

فیض کی شاعری میں رومان کو ایک نمایاں پہلو کے طور پر زیر بحث لایا گیا ہے اور اس طرح کبھی فیض کو رومان پسند شاعر کہا گیا ہے اور کبھی یہ کہا گیا ہے کہ فیض کی شاعری میں رومان اور حقیقت کی مربوط صورت دکھائی دیتی ہے۔ یہ دونوں رویئے فیض کے شعری طریقہ کار کا سطحی جائزے ہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ پروفیسر کرار حسین نے بھی ایسی ہی سطحی تشخیص کی ہے۔ تاریخی اعتبار سے فیض کی شعری تخصیت کا زمانہ اختر شیرانی ہی کا زمانہ تھا۔ اور یہ کہنا درست ہو گا کہ فیض نے رومان کو اپنے شعری مزاج میں وہ مقام ضرور دیا ہے جو شعری آب و ہوا کے زیر اثر ممکن ہو سکتا ہے اور اس طرح رومان (اختر شیرانی، اور تغزل (حافظ) اور فارسی شاعری)، کو اپنے شعری تشخص میں شامل کیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں قابل غور بات یہ ہے کہ اختر شیرانی کی شاعری کا رومان ان کی (اختر شیرانی کی)، شاعری کا مقصد ہے۔ اور رومان شاعر کے اظہار ذات کو بیان کرتا ہے۔ اس کے برعکس فارسی شاعری کا تغزل شعری دریافت اور معرفت کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ درست ہے تو ایسا کہنا بھی درست ہو گا کہ فیض نے رومان کو ذریعے اور وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور اس طرح اس انسان کے تصور کو (جسے نئے علوم نے فیض تک پہنچایا تھا) نمایاں کیا ہے جو فیض کا اصل شعری موضوع ہے۔ انسان، فیض کا بنیادی موضوع ہے۔۔۔

(۴)

فیض نے جس انسان کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اس کی زندگی کا زائچہ نئے علوم اور انگریزی شاعری نے تیار کیا تھا جسے انسان کی آزادی کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے فیض انسان کی آزادی کا شاعر ہے۔ اور ایک ایسی دنیا کی معرفت اور دریافت کا خواہشمند ہے جہاں آزادی اپنی بہترین صورتوں کے ساتھ ممکن ہوتی ہے۔ ایسے انداز فکر کو اپناتے ہوئے فیض نہ صرف اپنے علمی پس منظر کا اثبات کرتا ہے اور جدید انسانی فلسفے کی تائید کرتا ہے بلکہ اپنے عہد کے اس رویئے کی تصدیق کرتا ہے جو رویہ شاعر کو معتبر دنیا کا خواب مہیا کرتا ہے۔ فیض کے بعد ہمارے شاعروں نے نہ تو معتبر دنیا کا خواب دیکھنے کی نہ تو خواہش کی

ہے اور نہ ضرورت ہی محسوس کی ہے۔ فیض نے اپنے عہد کے جس انسان کو دریافت کیا وہ ناموافق اقتصادی حالات سے دوچار ہوتا ہوا انسان تھا اور جس کا ذکر خود فیض نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں کیا ہے جو متاعِ لوح و قلم میں شائع ہوا ہے۔ یہ انسان ایک بڑے استحصالی نظام کے اندر محصور اپنی انسانی ضروریات سے محروم انسان تھا۔ اس انسان کے اردگرد بھوک، افلاس اور بیماری کی فضا دکھائی دیتی ہے ..... شاعر کی آنکھ ان لوگوں کی جانب خود بخود مڑتی ہے اور وہ ان کی محرومی کا ذکر کرتا ہے۔ (اناج اگاتے ہوئے کھیت اور بھوک اگاتی ہوئی فصل)... انسان کی ایسی اقتصادی پریشانی روشن خیال یورپی رویوں اور رومانی شاعری کی انسانیات سے اپنا مفہوم حاصل کرتی ہے۔ انیسویں صدی کا یورپی انسانی فکر ایسی صورتِ حال کا واضح اظہار کرتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد برصغیر بے روزگاری اور افلاس کا بری طرح شکار تھا۔ اور برصغیر کے دانشور ان حالات کو غیر ملکی تسلط کا نتیجہ بھی تصور کرتے تھے۔ فیض کی شاعری اپنے اس ماحول میں جہاں انسانی دکھ کی نشاندہی کرتی ہے وہاں اس صورتِ حال سے نکلنے کی واحد صورت کی طرف اشارا کرتی ہے کہ اگر روزگار فراہم کیا جائے اور بھوک سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں ان کے لئے کی سہولتیں مہیا کی جائیں تو شاید انسان کا دکھ دور کیا جا سکتا ہے۔ فیض کی شاعری اس زمانے میں برلزم کی شاعری ہے۔ لیکن اس شاعری کا طریق کار محصور انسانوں کی صورتِ حال سے وابستہ ہے ایسی کیفیت ورڈز ورتھ کی ابتدائی نظموں میں بھی بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس طرح یہ اصول سامنے آتا ہے کہ اگر ماحول کو بدل دیا جائے تو انسان کے دکھ کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی مظلومی اپنے ماحول کے جبر سے پیدا ہوتی ہے اور ماحول کے جبر کو احساسِ ہمدردی کے ذریعے زائل کیا جا سکتا ہے۔ فیض کے شعری فلسفے میں اس اعتبار سے ماحول اور مظلوم انسان کا باہمی رشتہ مرکزی اہمیت اختیار کرتے دکھائی دیتا ہے۔ ماحول کے ایسے تصور میں برصغیر اور برطانوی استعمار کو حوالے کے طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔ بھوک افلاس اور بیماری مظلومیتِ انسان کے ابتدائی مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں

فیض کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے چند باتیں ایسی بھی ہیں جن کا تذکرہ مناسب ہے فیض اپنی علمی تربیت اور لیکچر شپ ان انگلش (ایم اے او کالج امرتسر، ہیلی کالج آف کامرس لاہور) کے حوالے سے مغربی برلزم کے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری جنگ (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) کے دوران وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے شعبہ اطلاعات میں شامل تھے اور انہوں نے برطانوی وار پالیسی کے سلسلے میں خدمات انجام دی تھیں۔ ان کی اپنی زندگی برطانوی مڈل کلاس کی زندگی تھی۔ اور ان کی

ازدواجی زندگی میں برطانیہ کی ایک بیٹی برابر شامل رہی ہیں۔ اس ضمن میں قابل ذکر یہ ہے کہ برطانیہ کی وہ لڑکیاں جو برصغیر کے گھرانوں میں ازدواجی ذمہ داریوں میں شریک ہوتی رہی ہیں لبرل اور روشن خیال، رویّوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اور انہوں نے عموماً لبرل تحریک کے مقاصد کی پیروی کی ہے۔ ایسے انداز فکر نے سوشل ویلفیئر کو مظلومیٔ انسان کے رفع کرنے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ جن باتوں کی طرف اشارا کیا گیا ہے ان سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ فیض اپنے ابتدائی شعری اور تخلیقی دور میں مغربی اعتبار کے مسلمان دانشور تھے۔ جن کا فکری انداز نظر لبرل تھا اور جو مظلومیت انسان کو سوشل ویلفیئر کے دائرے میں حل کرنے کی تحریک کا حصہ تھے۔ استعمار اور غیر ملکی حکومت کا تصور بھی سوشل ویلفیئر کا قائل تھا۔ اور آزادی کی تحریک بھی ایسے ہی مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتی تھی۔ فیض کی آزادی کی تحریک کے ساتھ تعلق بھی دانشورانہ تھا۔ اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بھی اس تحریک کے ساتھ تھیں۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا ضروری ہے کہ برطانیہ کی لبرل تحریک بھی آزادیٔ برصغیر کی قائل تھی۔ اور برصغیر کی آزادی کا بل بھی ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کی لیبر حکومت کا مرہون منت ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل فیض کی شاعری میں برطانوی حکومت کے بارے میں کوئی تلخ لفظ سنائی نہیں دیتا۔ ان کا تمام تر شعری احتجاج اقتصادی نوعیت کا ہے جسے سوشل ویلفیئر پروگرام حل کر سکتا ہے۔

(۵)

پاکستان کے قیام کے وقت فیض کی عمر ۳۶ سال تھی۔ اور وہ پاکستان ٹائمز لاہور کے ایڈیٹر تھے۔ ایک بہتر دنیا کے قیام کے خواہاں دانشور اس زمانے میں واقعی ایک نئی اور بہتر دنیا کے خواہشمند تھے۔ قوموں کی زندگی میں آزادی اور قیام وطن کا واقعہ معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ ایسا ان تاریخ میں پہلی بار طلوع ہوتا ہے۔ اور رات کے خوبصورت خوابوں کو ساتھ لئے اپنے اجالے میں اچھے خوابوں کی اچھی تعبیر کے وعدوں کو ہمراہ لاتا ہے۔ اس واقعے کو گزرے ۳۸ سال ہو چکے ہیں اور اتنے فاصلے سے پیچھے دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ خواب دیکھنا اور ان کی اچھی تعبیر پانا دونوں رومانی رویے ہی ایک صورت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی ساری فضا ہی رومانی تھی۔ اور سیاست کا وہ عمل جسے تحریک آزادی کہا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے رومانی تھی۔ ورنہ سیاسی عمل کی وہ کیفیت نہ ہوتی جسے ہم اپنا بہترین اثاثہ گردانتے ہیں۔ اس زمانے میں جاگنا خلد تھا اور جینا جنت تھا۔ ایسے دور کے ساتھ فیض کا جس انداز میں سامنا ہوا اس سے فیض کی اعلیٰ شاعری پیدا ہوئی ہے۔ ان کے تصور انسان میں وسعت ہوئی ہے۔ اور فیض کی

دائمی شہرت قائم ہوئی ہے۔ راولپنڈی سازش کیس، منٹگمری جیل، دست تہ سنگ، اور زنداں نامہ اس صورت حال کو بیان کرتے ہیں جس سے ٹکرا کر خواب ٹوٹ گئے اور ٹوٹتے ہوئے خوابوں کے ٹکڑوں سے تڑپتا ہوا دل برآمد ہوا۔ فیض نے صورت حال کے اس سلسلے میں اس دل کو دریافت کیا جو برابر تڑپ رہا ہے۔ اور مقتل و دار کے رشتے سے رقص بسمل کی خبر دی... فیض کی اعلیٰ شاعری حکمران قوتوں کے ساتھ اہل دل کے تصادم کی حکایت ہے ؎

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

فیض کی شعری زندگی میں ان کا پہلی بار حکمران قوتوں سے سامنا قیام پاکستان کے بعد ہوا۔ اور ایسا ہونا کئی اعتبار سے منطقی تھا۔ علم سیاسیات کی لبرل روایت قومی حکومت کو فرد کی اعلیٰ امنگوں کی امانت دار سمجھتی ہے اور اس طرح قومی حکومت کا تصور اخلاقی تصور ہوتا ہے۔ قومی حکومت افراد کی اخلاقی طور پر قیادت کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ اور وہ کسی طرح افراد کی امنگوں کو نہ تو نظر انداز کر سکتی ہے اور نہ ٹھکرا سکتی ہے۔ تاہم بدقسمتی سے جن حکمران قوتوں نے قومی حکومت کا منصب سنبھالا تھا وہ قوتیں علم سیاسیات کی بنیادی روایت سے تھیں۔ اور حکومت کو مملکت کے ساتھ خلط ملط کرنے کی عادت اختیار کر چکی تھیں۔ یہ ایک روح فرسا منظر تھا اور اس منظر میں پہلی بار (کم از کم قومی تاریخ کے حوالے سے) انسان اور حکمران قوتوں کا متحارب رشتہ ظاہر ہوا تھا۔

(۶)

فیض نے اس زمانے میں، انسان اور حکمران قوتوں کے درمیان جس متحارب اور غیر متوازن رشتے کی آواز بلند کی تھی وہ بگڑا ہوا غیر متوازن انسانی رشتہ صرف ایک جغرافیائی منطقے کی روداد نہ تھا۔ بلکہ ایسا غیر متوازن رشتہ تیسری دنیا کے ملکوں میں دور دور تک دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے باوجود کہ تیسری دنیا کی بیشتر قیادتیں عہد حاضر کے علوم سے بہرہ مند تھیں۔ اور انہیں علم سیاسیات کی بنیادی روایت کا بخوبی علم تھا۔ تیسری دنیا کی انسانی صورت حال اقدار کے اعتبار سے پریشان کن تھی۔ اور انسان کی آزادی کا تصور مشروط ہو چکا تھا۔ تاہم یہ باتیں ایسی ہیں جن کو دہرانے کی شاید ضرورت نہیں ہے۔ مگر ان کے جائزے اور اشارے سے انسان کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ صورت حال اس (صورت حال) سے کئی درجے مختلف تھی (اور رہی ہے) جو فیض کے ابتدائی دور میں نظر آتی ہے، بھوک افلاس اور بیماری کے مسائل کو سوشل ویلفیئر پروگرام

کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان اور حکمران قوتوں کے متحارب رشتے کو متوازن رشتے میں بدلنا غالباً اتنا آسان نہیں ہے۔ حکمران قوتوں اور انسان و انسانی اقدار کے مابین اقتدار کا حجاب حائل ہو کر جن کیفیتوں کو رونما کرتا ہے اور جن سے تیسری دنیا کے انسانی تجربات ناآشنا نہیں ہیں۔ وہ کیفیتیں فیض کی شاعری کو گہرا مفہوم دیتی ہیں۔ یہ گہرا مفہوم آزادی کے تصور کی حفاظت کو نمایاں کرتا ہے.....

تاہم اگر فیض کی شاعری کے اس دور کا اور قریب سے جائزہ لیا جائے تو اس عہد کے کلچر میں مشینوں کی درآمد اور صنعتی ترقیاتی منصوبہ بندی دکھائی دیتی ہے۔ تیسری دنیا مشین اور ٹیکنالوجی کے ساتھ عہد حاضر میں داخل ہونے کی جد و جہد کرتے نظر آتی ہے۔ بظاہر یہ مشین، زمین کی لینڈ اسکیپ پر ابھرتے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن حقیقت میں حکمران قوتیں اپنے کردار کو مشین میں بدلتے نظر آتی ہیں یہ صورت حال مشین اور انسان کے رشتے کو ظاہر کرتی ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مشین اپنا کردار بدل نہیں سکتی۔ غالباً اسی لئے تیسری دنیا کے ملکوں میں انسانی اعتبار سے نہ تو حالات کی صورت بدلی ہے اور نہ آزادی کا وہ تصور ظاہر ہوا ہے جو فیض کی نسل کے رومانی نظریے نے اپنایا تھا۔ فیض کی شاعری میں مشین اور ٹیکنالوجی نظر نہیں آتے۔ لیکن جبر کا ایک ایسا چہرہ ضرور دکھائی دیتا ہے جو انسانی آواز کو سننے سے قاصر ہے۔ اسے کئی ناموں سے پکارا جا سکتا ہے اور اسے کسی بھی آب و ہوا میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ فیض نے ایسے کئی ناموں اور ایسی آب و ہوا کے کئی ایک انسانی خد و خال کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ اور اس شاعری کے ساتھ ان کا گہرا تعلق ہے۔

(۷)

فیض کی شاعری کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ فیض کی شعری زبان بہت محدود ہے۔ انہوں نے غزل کی زبان استعمال کی ہے لیکن اس زبان کے ذخیرہ الفاظ سے فیض نے مکمل طور پر استفادہ نہیں کیا۔ گزشتہ دنوں آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی وژن سے فیض کے بارے میں یہی کچھ کہا گیا تھا۔ انہوں نے فیض کی محدود شعری زبان کو خاص طور پر قابل غور ٹھہرایا ہے۔ معلوم نہیں کہ محدود شعری زبان سے کیا مراد ہے، اس کا ذخیرۂ الفاظ کئی شاعروں کی تخلیقی محنت کا ثمر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک شاعر، روایت کے ذخیرۂ الفاظ میں سے محدود الفاظ ہی کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ فیض کا موضوع کیا ہے؟ اور کیا فیض کا ذخیرۂ الفاظ اس موضوع کے لئے سازگار ہے یا نہیں ہے... فیض کی اعلیٰ شاعری کے موضوع میں انسان اور حکمران

قوتیں بخوبی دکھائی دیتی ہیں۔

فیض کی شعری زبان، غزل کی روایت اور غزل کے ذخیرہ الفاظ سے رسم و سلوک اور الفاظ کا انتخاب کرتی ہے اور ان چنے ہوئے لفظوں کے ذریعے صورت حال کو بیان کرتی ہے۔ فیض نے جس شعری رسم و سلوک کے لیے الفاظ کا انتخاب کیا ہے وہ اسے کڑی ابتلا کی نشاندہی کرتا ہے جو اقتدار اور انسان کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ فیض نے اس ابتلا کو مقتل و دار سے تعبیر کیا ہے اور انسان کو بسمل اور اس کے عمل کو رقص بسمل کی صورت دی ہے اور ان چند چنے ہوئے لفظوں کے ارد گرد آزادی کے تصور کو نمایاں کیا ہے۔ اور اس طرح اس شعر کی اپنے عہد میں از سر نو تفسیر کی ہے کہ۔ کشتگان شیوہ تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر است ....اور ایسی صورت حال کو صرف چند بڑے بڑے لفظ ہی بیان کر سکتے ہیں۔ کیونکہ صورت حال ازلی نوعیت کی ہے۔ اور انسان کا رشتہ فرعون اور نمرود کے ساتھ دائمی مبارزت کا ہے...

(۸)

فیض کے کلام کے بارے میں کئی باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ انہوں نے غزل ہی کو اپنے اظہار کا ذریعہ کیوں بنایا۔ اور نظم کو غزل ہی کے لہجے میں کیوں تحریر کیا۔ کیا اس کی وجہ ان کی غزل کے ساتھ رغبت ہے یا یہ کہ غزل برصغیر کے شعری مزاج کی نمائندہ رہی ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ معقول ضرور ہیں لیکن فیض کے علمی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا درست دکھائی دیتا ہے کہ فیض نے تغزل کو ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور رومان کے اجزا بھی ایسے ہی مقصد کیلئے بروئے کار لائے گئے تھے۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کیا فیض کی شاعری مظلوم انسانوں کو ان کی منزل کی جانب لے جانے کی ایک جاندار کوشش ہے؛ ظاہر ہے کہ شاعری کے ذریعہ نہ تو بھوک کو مٹایا جا سکتا ہے اور نہ بیماری کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح شاعری نہ تو حکمران قوتوں کو مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اقتدار سے الگ ہو جائیں اور انسانوں کو ان کے کھائے ہوئے حقوق دلا سکتی ہے۔ شاعری از خود ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی۔ اور اس زمانے میں رائے عامہ کو منظم کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ فیض صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے ایک بار مجھے کہا تھا کہ انقلاب فوراً برپا نہیں ہوتے۔ اور حالات کے بہتر ہونے میں عرصہ لگتا ہے۔...

فیض کی شاعری کو بدلتے ہوئے انسانی ماحول کے حوالے سے پہچاننا ضروری ہے۔

تیسری دنیا کا انسانی ماحول بدل رہا ہے۔ انسانی رشتے بدل رہے ہیں، اور انسانوں کے باہمی تعلقات نئے نئے تقاضوں سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اس انسانی ماحول میں فیض کی شاعری۔ اس دل کی نمائندگی کرتی ہے جو محسوس کر سکتا ہے۔ تڑپ سکتا ہے اور ٹوٹ سکتا ہے۔ عقل و خرد کے زمانے میں فیض نے دل کی بات کہی ہے اور دل کے دھڑکنے کو اہمیت دی ہے۔ تاکہ انسانوں کے درمیان ہمدمی قائم رہے۔ درد کے رشتے باقی رہیں اور انسان جبر کے ہاتھوں نہ تو ختم ہو جائیں اور نہ مشین کے سامنے خود مشین بن جائیں، فیض کی شاعری اس قبیلے کو قائم کرتی ہے جو دل اور اہل دل کا قبیلہ ہے۔ "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست ....." فیض کا شعری پیغام غالباً یہی ہے کہ محسوس کرنے والا دل ہی غیر فانی ہے

(۹)

فیض کے ذریعے اردو شاعری نے تیسری دنیا کے ساتھ اپنا رشتہ قائم کیا ہے۔ اور اس دنیا کے بدلتے ہوئے تمدنی ماحول کو اس سچائی کا پیغام دیا ہے کہ جب تک انسان کے جسم میں دل دھڑکتا ہے انسان کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ اور جب تک انسانوں کے درمیان محسوسات کا رشتہ قائم ہے۔ انسان کبھی اپنی آزادی سے محروم نہیں رہ سکتا۔ عین ممکن ہے کہ جبر اور ظلم کی جن صورتوں سے ہمارا عہد آشنا ہے وہ صورتیں باقی نہ رہیں اور انسان کی تاریخ میں نئے ارادے ظاہر ہوں اور ایک بہتر دنیا رو نما ہو۔ اس وقت شاید نہ تو ظلم اور جبر کا موضوع باقی ہو گا۔ اور نہ ایسے انسان ہوں گے جو حکمران قوتوں کے ساتھ متحارب رشتے کا سبب بنتے ہوں گے۔ ایسی صورت میں فیض کے حوالے سے صرف محسوس کرتا ہوا دل دکھائی دے گا۔ دل جو تنہائیوں میں گفتگو کرتا ہے اور زندگی کے خوبصورت چہرے کو اور زیادہ خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے۔ فیض۔ ہمارا فیض ایسے ہی انسانی منظر کا شاعر ہے۔ جس کے پرے بہتر دنیا آباد ہے۔ اور انسان ایک نئے زمانے میں داخل ہوتا ہے۔

عتیق احمد

فیض کا ذہنی سفر اور سمتِ فکر

فیض کے فن اور محاسنِ شاعری کے مداح جہاں اثر لکھنوی جیسے نقاد اور کلاسیکی ذوقِ شعری کے دلدادہ تھے وہیں سجاد ظہیر ایسے انقلاب پسند ہیں۔ ان دو حوالوں سے جن دو مختلف المزاج مکاتیب شعر و ادب کی روایات وابستہ ہیں فیض کے فکر اور فن میں ان کا ایسا امتزاج رہتا ہے جس سے انقلابی فکر اور اردو غزل کا کلاسیکی لب و لہجہ اپنی اپنی شناخت قائم رکھتے ہوئے ہی زیرِ حوالہ دونوں مزاجوں کو راس آتا رہا۔ یہی فیض کے فن کی دین ہے اور یہی ان کے فکر کا وہ سرمایہ ہیں جو ہر عہد کی جدید تر ادبی نسل کو بھی فکر و فن کی روشنی دکھاتا رہے گا۔

فیض کے ابتدائی ذہنی دور پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اس دور کے ہر نوجوان شاعر اور ادیب کی طرح انھوں نے بھی اپنے محسوسات کے ترسیلی ذریعہ یعنی غزل کو اپنا مبدءِ عمل ٹھہرایا۔ داغ کی غزل ان دنوں سکۂ رائج الوقت تھی، اور حسرت کی ذات اور ان کا فکری انداز منفرد تحت یہ اپنی ابتدا میں ہی فیض کا یہ فنکارانہ ضبط ایک کمال ہی ہے کہ انھوں نے اوچھے سرِ دل کا جذباتی سہارا لیا اور نہ عشقیہ جذبات کو نقطۂ ابتدائی میں داخل ہونے کی اجازت دی تپتے ہوئے عشقیہ جذبات کا گہرا عکس ان کی غزل پر ہی سایہ فگن رہا۔ لیکن آدابِ محفل کی یہ پاس داری ان دنوں کی غزل میں حسرت کے یہاں بھی کم کم ہیں۔ فیض کا تو یہ عالم ہے کہ وہ پورا منہ کھول کے بات کرنا ہی جذبۂ عشق کی توہین اور آدابِ عشق کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جس "موضوعِ سخن" کو لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ۔ ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط، "طبع شاعر کا "ناگزیر" وطن" کا درجہ دیتے ہیں، اس کے پس منظر سے ہی فیض کا اتنا ہی ربط و ضبط ہے ضبطِ محبوب کے کوچہ و گلی سے۔ پس منظر کے ان گلی کوچوں میں بھوک ہے، مفلسی ہے، "ان گنت صدیوں کے

تاریک بہیمانہ ظلم" کی نوادرنی ہیں اور

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

فیض کی شاعری کے اس پس منظر کے گلی کوچوں کی زندگی کی پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی تیسری اور چوتھی دہائی کا وہ حبس اور گھٹن کا دور ہے جس میں نوآبادیاتی اور طبقاتی نظام کی تعزیراتی فضا غیر متوازن معاشی صورتِ حال بے روزگاری اور نوجوانوں کے سامنے غیر متعین مستقبل کا الجھاہوا خاکہ بے زاری اور بے دلی کی کیفیتوں کو عام کر رہے تھے۔ اس دور کا نوجوان جس ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا اس کی نوعیت تو اس کے شعور و ادراک کی زد میں تھا۔ لیکن عملی طور سے اس سے نپٹنے کا راستہ اس کے سامنے مسدود تھا۔ نتیجتاً اس دور کی نوجوان نسل پابندیٔ اظہار و عمل کی راہیں بند پا کر کچھ تو یوٹوپیئن ماحول کے کیف آور خواب دیکھنے، رومان کی وادیوں میں جابراجی اور کچھ جنسی اور جذباتی الجھنوں کے تانے بانوں میں اسیر ہو کر رہ گئی۔ ایسے نوجوان اس دور میں گنتی کے چند ہی تھے۔ جنہوں نے اس دور کی اخلاقی پابندیوں کی ناروائیوں اور نفسیاتی الجھنوں کی فضا کے خلاف صف بندی کی۔ یہ دراصل ان کی دھندلائی ہوئی انقلابی رہِ عمل کا پہلا سفر تھا۔ جس میں تعمیری ضبط و جذبہ ہی چند ہی کی روش تھی۔ اس سفر کی بد ہیئتی کتنی ہی قابلِ اعتراض کیوں نہ قرار دی جاتی رہی ہو، اس میں بدنیتی یا بدطینتی کہیں نہیں تھی۔ اور سب سے اہم پہلو یہ کہ بہرحال یہ آغازِ کارِ مرداں تو تھا ہی کہ لفظِ جنس کے نام سے جو طبقہ ان دنوں بن بیاہی لڑکیوں کی طرح شرمانے کی اداکاری کرتے تھے اُن کی خلوتوں کی دنیا کن رنگینیوں اور بداعمالیوں سے سجی اور بسی رہتی تھی۔ اس کی شہادتیں۔ عدم ثبوت کے مقابلے میں اس دور کی داستانوں میں بکھری پڑی ہیں۔

ہر چند کہ فیض اپنی عشقیہ شاعری میں نفسیاتی الجھنوں اور حُسن کے شوقیہ شعاروں میں نہیں تھے۔ پھر بھی فیض نے اپنی طبیعت کے اس رنگ کو دھندلانے نہیں دیا جو رومان پسندی کا رنگ تھا، جنس پسندی کا نہیں۔ اس دور میں بھی وہ انہوں نے اپنے اس رنگِ طبیعت کو خاصا اجاگر کر دیا تھا۔ جوان کے ہم عصر نوجوانوں نے "انگارے" کی اشاعت

سے اپنی انقلابی افتادِ طبع کے طور پر نمایاں کیا تھا۔ "نقشِ فریادی" بھی گواہی موجود ہے کہ ان دنوں بھی فیض اپنے اس رنگ شاعری سے مطمئن نہیں تھے۔ جو اس مجموعہ میں بہت گہرا آیا ہے چنانچہ انھوں نے اس کا اعتراف یہ لکھ کر کیا "شعر لکھنا جرم نہ سہی، لیکن بے وجہ شعر لکھنا ایسی دانشمندی بھی نہیں"۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ "نقشِ فریادی" کی شاعری تیسری اور چوتھی دہائی کے اول دور کی شاعری ہے۔ اس دور کے فکری نقوش کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے جو اس عرصہ میں جوان ہونے والی ادبی نسل کے لیے ذہنی سانچوں کا کام کر رہی تھی۔

فیض اپنی کم گوئی کے سبب نقشِ فریادی کا دیباچہ لکھتے ہوئے یہ بات محسوس کرتے تھے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے عملاً ۱۹۳۵ء میں وابستہ ہو جانے کے باوصف اپنے اس مجموعہ کلام میں ۱۹۴۰ء کے منشور کے ہم پلہ نظر نہیں آتے تھے حالاں کہ ذہنی اعتبار سے وہ ترقی پسند تحریک میں شامل نوجوانوں میں سے کسی سے پیچھے بھی نہیں تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر نقشِ فریادی، میں ان کی دو نظمیں "رقیب سے" اور "موضوعِ سخن" شامل نہ ہوتیں تو شاید فیض اپنے باقی کلام کا مجموعہ چھپواتے وقت اس سے کہیں زیادہ حیص بیص میں نظر آتے جتنا کہ وہ اس دیباچہ میں ملتے ہیں۔

"نقشِ فریادی" کی شاعری کا بہت بڑا حصہ رومانی و فور ہوتے ہوئے بھی ایسی سوجھ بوجھ رکھنے والے نوجوان کی نشان دہی کرتا ہے جس کے ہونٹ ایک اندرونی تپش کے سبب پپڑائے ہوئے ہوں اور وہ بے چینی سے کسی چشمۂ آب کی جستجو میں ہو۔ "موضوعِ سخن" اور "رقیب سے" "سے ہٹ کر ہم لوگ" "مجھ سے پہلی سی محبت" اور "چند روز اور مری جان" میں ہمیں ان کی اس تلاش اس لگن اور اس پیاس کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔

"دستِ صبا" کا سنِ اشاعت ۱۹۵۲ء ہے اس مجموعہ میں فیض ہمیں اپنی منزل کی راہ سے پورے طور پر باخبر اور اپنے اندازِ بیان میں زیادہ کھلتے ملتے ہیں، حالاں کہ حالات کی ستم ظریفی نے انہیں ان دنوں مقدمہ بغاوت کے ذیل میں جیل کی چار دیواری میں محبوس کر رکھا تھا۔ فیض نے عشق اور رومان کی جس طربناک اور خواب آور فضا میں اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اس ہی عشق اور رومان پسندی نے ایک لگن اور تپشِ آشنا کر کے غریبوں

حیثیت زبردستوں کے مصائب اور دکھ درد کے معنی آشنا کرانے والی پُرخار وادی کی مسافت کی راہ پر کبھی لگا یا فیض کی شاعری کا یہ دور بڑے دھڑتے سے پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے اسے پڑھ کر گرتے رہنے کا دور ہے۔ فیض کی شاعری کا یہ سرحصہ صبح آزادی سے شروع ہوتا ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس دور کی ساری تلخیاں آگے چل کر زنداں نامہ کی ایک غزل کے اس شعر میں مصور ہو گئے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

زنداں نامہ کی شاعری پر کوئی آٹھ نو برس پہلے لکھتے ہوئے اس دور کی ستم ظریفانہ نوعیت کی طرف راقم الحروف نے اشارتاً یہ عرض کیا تھا کہ یہ دور عجیب دلفریب تضادات اور ستم ظریفیوں کا دور تھا یعنی ایک طرف تو فیض قید و بند کی صعوبتیں ایک ایسے جرم کی بنا پر جھیل رہے تھے جو خود استغاثے کی نظر میں "پخت و پز" منزل کو بھی پوری طرح نہیں پہنچا تھا۔ دوسری طرف پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کے قتل میں ملوث اصل سازشی رفتہ رفتہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں اور راج سنگھاسن پر براجمان ہوتے جا رہے تھے ـــــ زنداں نامہ کی شاعری میں فیض کے بیشتر موضوعات اور شعر و سخن کا محور یہی منافقت آمیز ماحول ہے۔ جو ان کے ادوار کی طرح دوسروں کے احساس دل سوچنے والے دماغ اور دیدہ بینا کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ ان دنوں فیض کا یہ شعر ایوانِ اقتدار کے لیے داغِ ندامت اور منافقت آمیز ماحول پر کڑھنے والوں کے لیے وجہ سکون بنا ہوا تھا۔

ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت دامن
رندِ میخانہ سے شائستہ حرام آتا ہے

فیض کی شاعری کا یہ بڑا وصف ہے کہ انھوں نے قوم پر ہر دور ابتلا میں وہ سب باتیں اور وارداتیں اپنی گرفت میں لیں اور اپنی شاعری میں انہیں ریکارڈ کر دیا جو اس دور کی "طرزِ فغاں ٹھہری" تھی۔ اس ہی دور ایوبی میں یہ "ستم ظریفی" بھی ایجاد بندگانِ بارگاہ باش کی دیکھنے میں آئی کہ حرب و ضرب کے کبل کانٹوں سے لیس مارشل لا کے فیلڈ مارشل چیف

ایڈمنسٹریٹر (ایوب خاں) نے الیکشن لڑا تو گلاب کا پھول نشان شناخت پسند کرایا گیا۔ فیض کے دیدۂ بینا کی داد کیا دیجیے "اس قطرہ" میں کیا دجلہ دیکھا اور دکھایا۔

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خون ناب جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں، کاسۂ سر لے کے چلو

ڈاکٹر سہیل آغا نے اپنے مضمون "فیض اور غالب" میں بھی فیض کے ان اشعار کی معنویت کو مندرجہ بالا تاریخی تناظر میں جس طرح سے دیکھا ان کے اس خیال کی تائید شعر و ادب کی تخلیق میں تاریخ عصر کے کردار سے ہوتی ہے۔ غالب کے بعد فیض ہی اردو شاعری میں دوسرے اور واحد شاعر ہیں جن کے نقطۂ نظر میں مستقبل بینی اور تاریخ سازی کا جوہر اپنے عروج پر ہے۔ دستِ صبا کی ایک نظم "صبح آزادی" کا حوالہ اس سے پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔ ادب کے قارئین کو اچھی طرح یاد ہو گا کہ اس کے شعر "یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر۔ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" پر ان دنوں سرکاری صفوں میں کہرام بپا ہوا تھا سو ہوا، اس دن سے فیض پر وطن دشمنی کا جو لیبل چپکا دیا گیا تھا آج ان کی وفات کے بعد بھی ہماری صالح صحافت کے مجاہدانہ کارناموں میں اس لیبل کی روشنائی آج تک بدستور عاقبت سازی کا سامان بنا ہوا ہے۔ یہ حیلہ جوئی بھی اس شخص کے بارے میں برتی جاتی ہے جس نے ماضی، حال اور مستقبل کی طنابیں کھینچ کر اپنی ذات کے تمام دریچے اور دروازے لمحۂ حال کی سب وشتم پر کان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیے تھے:۔

نہ گنواؤ ناوک نیم کش، دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تن داغ داغ لٹا دیا

اپنے محتسبوں اور الزام تراشوں کے باب میں فیض کے ذاتی اور شعری لہجہ میں اس ادا کی ہمیشہ ہی فراوانی رہی لیکن "زنداں نامہ" کے بعد کے تمام شعری مجموعوں — دست تہ سنگ، سر وادی سینا، شام شہر یاراں اور مرے دل مرے مسافر میں اس لہجہ میں درد کی کسک اور کج کلاہی کا طنطنہ بیک وقت حاوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پہلے مارشل لاء ۱۹۵۸ء کے ساتھ ایک بے نمود ڈپریشن کی ایسی لہر ہماری سماجی

زندگی کے اوراد و وظائف پر طاری ہونا شروع ہوگئی تھی کہ باشعور عوام اور پڑھنے لکھنے والوں کے ذہنوں پر مایوسی اور پست ہمتی رچتی بستی چلی گئی۔ فیض اس صورتِ حال سے بہت دکھی تھے "سیر وادیٔ سینا"، شامل، دعا، لہو کا سراغ، غم نہ کر غم نہ کر، یہاں سے شہر کو دیکھو اور "سوچنے دو" ایسی نظموں میں بھی بے نمود اور بے آہنگ پریشان بولتا ہے۔ اس لہجہ میں غم و اندوہ کی اتھاہ کسک ہے سامراج کے چنگل میں پھنسے ہوئے تیسری دنیا کے نوآزاد لیکن اسیرِ مکرر ممالک کی تعمیرِ نو اور تغیرِ حالات کے لیے کی گئی کوششوں اور چلائی گئی تحریکوں کی ناکامی کا دھچکہ بھی عیاں ہے۔ کہیں کہیں سے ان نظموں کے دو چار اشعار دیکھیے جن میں یہ تلخی اور ستم پیشوں کی دُنیا کی صاف جھلکیاں بھی ملتی ہیں کہ ان کی طرزِ ستم کو احسان مندی اور رات کو دن کہو:۔

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ\
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے\
نہ دیں کی نذر کہ بیعانہ جزا دیتے\
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا\
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا\
پکارتا رہا، بے آسرا، یتیم لہو\
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ\
نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا\
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

(لہو کا سراغ)

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ\
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل\
ہر ایک راہ گزر، گردشِ اسیراں ہے\
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں\
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبو

جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہے
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا کہ پھول ہیں کہ لہو
(یہاں سے شہر کو دیکھو)

یہ شہر کوئی ایک خصوصی اور پاکستان کا شہر بھی ہو سکتا ہے اور تیسری دنیا کا کوئی بھی شہر، کوئی بھی ملک ہو سکتا ہے۔ "سو چنے دو" میں فیض کا لہجہ اور بھی بے دھڑک ہے۔

ہم سے اس دیس کا نام و نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوب گذشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبوب یا محبوبہ کا دل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی رات بتانے کے لیے

اب اس پس منظر میں "یہاں سے شہر کو دیکھو" کا یہ بند

جو کوئی تیز چلے راہ تو پوچھے ہے خیال
ٹوکنے کو کوئی للکار کیوں نہیں آئی
جو کوئی ہاتھ چلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی

ایک ایسا دلدوز تقابل پیش کرتا ہے جس سے فیض کے دل و دماغ میں چھڑی ہوئی اس پیکار کا اندازِ جبری کھل کر سامنے آجاتا ہے جس پر کبھی وفورِ رومانیت کا غلبہ ان کی شاعری کو بہت سوں کے لیے صرف ایسی فنکاری کا نمونہ بنی رہی جس میں سے وہی بات خارج از ذکر رہی جو بار بار کہی گئی تھی۔

فیض کے ذہنی سفر کا تجزیہ اتنا آسان بھی نہیں ہے کہ سرسری مطالعہ ہی کافی اور شافی ہو لیکن اتنا مشکل بھی نہیں کہ اس کا سراغ ہی نہ ملے۔ بس شرط اتنی ہے کہ ان کی عصری حقیقت اور عصر حاضر کے سماجی پیکر میں ظالموں اور مظلوموں کے درمیان بڑھتی ہوئی کشاکش کا کوئی منصفانہ تصور پڑھنے والے کے ذہن میں ہو۔ اس امر کی جتنی شہادتیں اوپر پیش کی گئیں ہیں ان سے

کہیں زیادہ کلامِ فیض میں فراواں ہیں۔ "دستِ تہہ سنگ" کے دونوں مرثیے حسن اختر کی قید و بند اور بعد کو اس کی موت (جسے انتہائی مضحکہ خیز طور پر خودکشی کا نام دیا گیا تھا) کے متعلق ہوتے ہوئے بھی تیسری دنیا کے ایسے درجنوں حریت پسندوں کی پھانسیاں اور قتل یاد دلاتے ہیں جن پر جیتے جی زندہ رہنے کا الزام لگتا رہا اور مروا دیے گئے تو خودکشی کے مجرم قرار پائے۔

یہ بات کسی انکشاف کے ذیل میں نہیں آتی کہ فیض کا نقطۂ نظر ان کی انسان محبت بلکہ انسان عشق پر اساس ہے۔ ان کی انسان دوستی اور ان کی شاعری کے غنائی لہجہ کا ذکر سب ہی بالالتزام کرتے ہیں یہ تذکرہ حق کی بات بھی ہے۔ لیکن یہ ذکر ہم میں سے بیشتر کچھ اس انداز میں کرتے چلے آئے ہیں گویا یہ کوئی قائم بالذات قسم کا جذبہ ہے اور ایسا تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔ بات بڑھائی بھی تو زیادہ سے زیادہ ع

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا

تک ٹھہر جاتی ہے۔ لیکن فیض جن اسباب و وجود کو سامنے رکھ کر غریبوں اور زیردستوں کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کا ذکر فیض کے غنائی، رومانی لہجہ اور شاعری کے کلاسیکی پیٹرن کی داد اور توصیف کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے یا پھر قلمی جہاد کا سارا زور فیض کی متذکرہ بالا خصوصیات کے حوالے سے باقی ترقی پسند شاعری اور شعر میں نعرہ بازی کی تکذیب میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ فیض کے رزم اور سبک لب و لہجہ سے کوئی انکار نہیں۔ غزل تو غزل، نظموں تک میں غنائیت کو برقرار رکھنے کا سلیقہ ان کے علاوہ اور کتنوں کو آیا ہے؟ لیکن اس غنائیت اور اردو غزل کی روایت کی پاسداری کے علاوہ کبھی تو کلامِ فیض میں کم از کم دو اہم عناصر تو ایسے بھی ہیں جن کی طرف توجہ لازم ہے ایک ان کا عربی دان اور عربی شاعری کا مزاج شناس ہونا جس کی بنا پر ان کے رومانی لہجہ تک میں رجز کا آہنگ نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ "دستِ صبا" میں ہی کہ جس پر "نقشِ فریادی" جیسا مضموں کی خامی ذولانی ہے، "لوح و قلم"، "نثار میں تیری گلیوں کے"، "زنداں کی ایک صبح"، "زنداں کی شام"، "ایرانی طلبہ کے نام" اور "دربارِ وطن میں" جیسا ترانہ بھی شامل ہیں۔

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب سے		پھر شعلے نکلنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو — پھر کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگذر سے

سرخرو سے تاج کج ہوا ہی چمن بھی بنا تا ہے۔ کلاہ ضروری ہے بوئے سلطانی نہیں جاتی۔

جیسے اشعار والی غزلیں بھی شامل ہیں دوسرا عنصر فیض کی انسان دوستی کا وہ پس منظر ہے۔ جس کے حوالے سے وہ بات کرتے ہیں۔ یعنی غریبوں اور زیردستوں کی وہ ٹکسال جہاں سامراجی ٹکسالیوں کے ردعمل سے یہ کھوٹے سکے ڈھالے جاتے ہیں جو دراصل فیض کے موضوعات تغیر و انقلاب کی محرک ہے۔ انہوں نے بہت دنوں پہلے راولپنڈی سازش کیس سے رہائی کے بعد دو ٹوک انداز میں یہ بات کہہ دی تھی کہ صرف ایسے ہی ادیب اور شاعر جو اپنے دور اور آنے والی نسلوں کے افراد سے محبت کرتے ہیں وہی ذاتی مفادات و اغراض سے بالاتر ہو کر غریبی اور بالادستی پھیلانے والوں کے خلاف زبان اور قلم سے جدوجہد کر سکتے ہیں۔ ایک اور بات انہوں نے یہ بھی ان ہی دنوں کہہ دی تھی کہ دوسرے بہت سے اہل دانش کی طرح وہ خود بھی اپنے قلم سے سماجی انصاف، جمہوریت، اظہار کی آزادی اور عوام کے لیے بہتر زندگی کے پہلے کی طرح آئندہ بھی شریک عمل رہیں گے۔ نئی نسلیں کراچی سے چھپنے والے اسی انٹرویو میں انہوں نے بین الاقوامی صورت حال پر ایک سوال کے جواب میں بڑے واضح انداز میں کہا تھا۔ "مشرق وسطیٰ، رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ کی صورت حال خطرناک ہو گئی ہے اور اس تمام بحران (خصوصاً ایران) میں ہونے والے نئے واقعات کی ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ مسئلہ کو بلیک میلنگ اور طاقت کے ذریعہ حل کرنے کے سلسلے میں امریکی اقدامات ایک بڑے فساد کو جنم دے سکتے ہیں ..... امریکہ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اب دوسری قوموں پر مرضی مسلط کرنے کا وقت گذر گیا۔" (انٹرویو - ۹، ۷، ۸۰)

بین الاقوامی معاملات اور حالات پر فیض کی اس گفتگو کی نوعیت نہایت اہم ہے اس لیے کہ بیرونی ذرائع ابلاغ کو دیا گیا یہ انٹرویو فیض کے سیاسی، سماجی اور ادبی مسائل پر براہ راست گفتگو پر مشتمل ہے اور [illegible] کے علاوہ دوسرے مسائل پر بھی وہ اسی اختصار کے ساتھ بات کرتے تھے۔ یہاں ان باتوں کو حوالہ بنانے کا مقصد فیض کی انسان دوستی کے اس بین الاقوامی احساس اور تصور کی نشاندہی کرنا ہے [illegible] کے مزاج شناس پنڈت زیادہ سے زیادہ غربت اور [illegible] کے حوالے سے فیض کے اصل مزاج کو رومانویت کا دوشالہ اڑھا دینے کے عادی ہیں

شک نہیں ہے کہ فیض کے انسان دوست مزاج میں متذکرہ دو عناصر کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی سطح پر سامراجی قوتوں اور ان کے حوارین کی ان سازشوں کا دکھ اور شعور بھی تو شامل ہے جن کا نشانہ تمام ترقی پذیر ممالک ہیں امن اور استحکام کے گمراہ کن نعروں کے نام پر شہری آزادیوں پر مسلح پہرہ داری مسلط کر دی جاتی ہے۔ جمہوریت اور جمہوری اداروں کا قتل عام ہوتا ہے، تحریر، تقریر، فن، سفر و مسافرت کی راہوں میں خار دار باڑیں کھینچ دی جاتی ہیں۔ ذرا "شام شہر یاراں" (تازہ مجموعہ کلام) کی ایک نظم "اے شام مہرباں" کا یہ بند بھی تو ان کا اسکیت کے متوازن کو پڑھوا دیجئے۔

دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے
کرچیاں دیدۂ حسد کی
خس و خاشاک رنجشوں کے
اتنی سنسان شاہراہیں،
اتنی گنجان قتل گاہیں
جن سے آئے ہیں ہم گزر کر
آبلہ بن کے ہر قدم پر

اس لیے کہ ان اشعار میں فیض کی انسان دوستی اور انسان محبت کا وہ وسیع تر بین الاقوامی دائرہ اور مزاج صاف عیاں ہے جو ان کے دکھ سے بوجھل لہجہ کی ترقی کا راز بھی ہے۔

یہ بات بار بار زور دے کر کہے بنا چارہ کار نہیں ہے کہ فیض کی فکر اور رجحانات اور ان کے ذہنی رجحانات کی آبیاری کرنے والے معیارات کی سطح تک اٹھے بغیر ان کی شاعری جس حد تک سمجھی جا سکتی ہے وہ اتنی ہی ممکن ہے جتنا کہ اب تک اس کے نرم لہجہ، کلاسکی روایت کی پاسداری اور بے جہت ڈھیلی ڈھالی ترقی پسندی کی تعریف کی جاتی رہی ہے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ کلام فیض کے حوالے سے ان کے اس غیر منصفانہ رویے کی نشان دہی کرنا نصیب نہیں ہوا جو فیض کی تخلیقی قوت کی اصل ہے فیض کی شاعری کے نظریاتی کھرے پن اور اُن کی سچ اور راست گوئی کی بات

شاید ان مفسرین فیض کو راس ہی نہیں آتی۔ حالانکہ ان کے مجموعہ کلام "مرے دل مرے مسافر" میں سے "تین آوازیں" "ہم تو مجبورِ وفا ہیں" اور "ندائے غیب" تو ایسی نظمیں ہیں جو پتھر دلوں تک کو زمانے کی سکت رکھتی ہیں لیکن یہ بھی چھو کر نہیں گزرتیں تو ان عاشقان فیض کو جو انہیں بھی شعر و حکمت کے گنبد میں خیر و برکت کا تعویذ بنا دینے کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔

ہر ایک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمع سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

اور اس کے ساتھ ہی "ہم تو مجبورِ وفا ہیں" کا یہ ابتدائی بند:

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیئے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

اور دوسرے بند کا یہ شعر

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا

اور ان اشعار کے ساتھ ہی اگر ان کی کچھ اور نظموں "پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو"، "حذر کرو میرے تن سے"، "آج بازار میں پابجولاں چلو"، "نینیا دیکھ تو ہو"، "ایرانی طلبہ کے نام"، "کتے"، اور "جول"، وغیرہ کو بھی ذہن میں تازہ کر لیا جائے تو یہ سمت واضح ہو جاتی ہے

ان کا اردو اور پنجابی کلام بین الاقوامی سطح کی انسان دوستی اس سمت کا واضح اشاریہ ہے جس میں ہر رنگ بیلائے وطن کا رنگ گہرا اور شفاف ہے۔

فیض کے ذہنی سفر کے اس سرسری خاکہ میں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے۔ یعنی یہ کہ ان کے یہاں جہاں منافقتی انداز، حیلہ جوئی اور اگر مگر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہی دوسروں کے اندر منافقت اور حیلہ جوئی بھی ان کے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے۔ قارئینِ شعر وادب کو یہ بات یاد دلانا کچھ بہت خوشگوار بات نہیں ہے راس لیے کہ میں انہیں اپنے سے بہتر فیض شناس سمجھتا ہوں) پھر بھی نوکِ قلم پر آئی بات کو کہنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ اور وہ بات یہ کہ فیض اپنے اس صاف گو رویہ کی نشاندہی بہت پہلے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" میں کر چکے تھے۔ ان کے ذہنی رویہ اور سمتِ فکر میں یہ اہم موڑ قطعئی بھی تھا اور بے تکلفانہ بھی۔ نوجوانی کے جذباتِ عشق و عاشقی سے بھری جوانی میں پوائنٹ آف ڈیپارچر ان کی جرأتِ فیصلہ اور اس نئے عشق کی راہ پر چل نکلنے کے عزمِ صمیم کا گواہ ہے، جو اجتماع کے عشق کی راہ ہے جس پر سفر میں ذات کے غم بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں اور ذات کی شناخت کا مسئلہ ایک لچر منطق کے سہارے کی دلیل بن جاتا ہے۔ پھر یہ محض اور شوقیہ پوائنٹ آف ڈیپارچر ہی نہیں تھا اس پر استقامت سے قائم رہنے کا عمل انہوں نے زندگی بھر جاری رکھا اور اپنے آخری دورِ حیات (کئی برسوں کے بعد وطن کو واپسی کے بعد) میں بھی اس بدلتے ہوئے انداز کی گیرائی اور گہرائی پیدا کرتے رہنے کی گرفت مضبوط رکھی۔ "مرے دل مرے مسافر" کی اس غزل سے بہتر اور سچا گواہ اور کہاں ملے گا۔

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا، ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا، ایسے نہیں ہوتا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا، ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا، ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب، ہر گھڑی گذرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا! ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا، ایسے نہیں ہوتا

اس سب کچھ کے بعد ہی یہ دعویٰ کہ فیض نے اپنے سبک، اور نرم لہجہ ہی کو اپنی فن کاری کا طرۂ امتیاز بنایا، ان نا انصافیوں میں سے ایک تو ہو سکتی ہے جو منافقانہ اور سامراجی معاشروں میں انقلابی فکر و عمل کا حلیہ مسخ کرنے کی خاطر رواں اور رواجی ہتھکنڈوں کی حیثیت رکھتی ہیں اعترافِ حقیقت البتہ نہیں ہو سکتی۔

یہ سب باتیں ایک طرف، اصل بات ان کے لیے لمحۂ فکریہ یہ ہونا چاہیئے کہ فکر فیض کا سورج تو ترقی پذیر ممالک کے حقیقت پسند اذہان کو آج بھی روشن اور منور کیے ہوئے ہیں، لیکن سامراج اور اس کے حوارئین کے سروں پر جس دن اس کی تمازت پہنچ گئی تو مد حساب خون بہا، دینے کو کن حیلے بہانوں سے ٹالیں گے۔ فیض کے یہ دو مصرعے پیشِ نظر رہیں۔

جو تم کہتے ہو، سب کچھ ہو چکا، ایسے نہیں ہوتا

مرے قاتل، حسابِ خوں بہا، ایسے نہیں ہوتا

آئی اے رحمٰن

فیض احمد فیض

ان دنوں فیض کے بارے میں لکھنا یا فیض کے ناتے اپنی شناخت کرانا باعث افتخار ہے اور اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرنا ایسی جرأت کا متقاضی ہے جو کمیاب ہے۔ میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی، لیکن مدیر ادب لطیف کے اصرار اور شریفانہ یاد دہانیوں نے فرار کے سارے راستے مسدود کر دیئے۔ مجھے یہ عذر گریز کا موقع بھی نہیں ملا کہ جس ادبی ماہنامے کو کچھ عرصہ فیض کی ادارت میں شائع ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے اس میں لکھنے والے ایک خاص مقام سے نیچے نہیں ہونے چاہئیں، اور ایک ایسے شخص سے فیض پر مضمون کا تقاضا کرنا جس نے کبھی سخن شناسی تو کجا اردو میں لکھنے کا دعویٰ بھی نہ کیا ہو۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس لیے از راہ کرم اس مکتوب نما تحریر کو مضمون کی APOLOGY سمجھا جائے تو مناسب ہوگا۔

ممکن ہے آپ یہ چاہتی ہوں کہ فیض کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھا جائے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا عام طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ فیض ہر اعتبار سے دنیا کے بڑے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جُوں جوں وقت گزرے گا ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ابھی تک فیض کے دلدادگان میں خاصی بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جو صرف ان کے شعر کے آہنگ، انکی غنائیت اور طرز بیاں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے بھی بہت ہیں جو فیض کے شعر میں اپنی قلبی واردات کی جھلک دیکھ کر تسکین پاتے ہیں۔ فیض کی شاعری کے فنی محاسن سے انکار ممکن نہیں نہ ہی ان کے اس کمال سے کہ وہ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر شاعر کا وہ اعلیٰ مقام حاصل کر لیتے ہیں جہاں شاعر، بقول امین مغل، تنہائی کا رفیق بن جاتا ہے۔ لیکن فیض کی شاعری کے مقصد سے الگ کر کے دیکھنا فیض اور خود اپنے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس لیے کہ فیض کے نزدیک شاعری زندگی میں حرکت اور تبدیلی کی جدوجہد کا ایک ذریعہ ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں حرکت اور تبدیلی کے خواہاں افراد اکثریت میں تو ہیں، لیکن ان کی حیثیت ابھی ایسی نہیں کہ وہ

فیض کے کلام کو سمجھ سکیں۔ اور ان کی وہی تشریح کریں جو شاعر کے ذہن میں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ فیض نے ساری انسانیت کے لیے لکھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہوں نے بے گناہ اور خطاوار، ظالم اور مظلوم میں فرق نہ کیا ہو یہ صحیح ہے کہ فیض نے بہتر زندگی کا مستحق سب ہی کو ٹھہرایا ہے لیکن اگر صرف "انتساب" پر ہی غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا خطاب زندگی کی مسرتوں سے محروم مخلوق سے ہے۔ اس میں افسردہ جاں کلرک ہیں، پوسٹ مین ہیں، تانگے والے ہیں، ریل بان ہیں، کارخانوں کے بھولے بھالے ہیں، ظالموں، ڈاکوؤں، پٹواریوں، سرکار اور زردار والوں کے ستائے ہوئے دہقان ہیں۔ بلکتے بچوں کی دکھی مائیں ہیں۔ آنکھوں کے گل کھلنے کی مسرت سے ناآشنا حسینائیں ہیں، طلباء ہیں جنہیں بے انت راتوں کے سائے بانٹے جاتے ہیں، مایوس اسیر ہیں۔ جب درد کی انجمن کے یہ کردار اپنی نجات کی راہ تلاش کر لیں گے اور زردرتوں کا بن گلستان میں تبدیل ہو جائے گا۔ تو یہ لوگ اپنے علم اور اپنے تجربے کی روشنی میں فیض کے شعر کی صحیح تشریح کریں گے۔ اور ثابت کر دیں گے کہ آج کے مراعات یافتہ نقادوں نے فیض کو کم سمجھا ہے۔ چونکہ جیسا اب ہے، ہمیشہ تو نہیں رہنا ہے اور پوسٹ مینوں، تانگے والوں، دہقانوں، دکھی ماؤں، زندگی میں بہار لانے والی حسیناؤں کی آزادی اور کامرانی تاریخ کا وعدہ ہے۔ اس لیے جیسے جیسے یہ مخلوق سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوگی، فیض کی عظمت کے نئے پہلو سامنے آتے رہیں گے۔ خاص طور پر پاکستان میں، یوں تو زندگی میں بہتر تبدیلی کا عمل ہر سماج میں بھاری قربانیاں طلب کرتا ہے۔ بعض تاریخی عوامل نے اس جدوجہد کو ہمارے دیس میں معمول سے زیادہ تلخ اور صبر آزما بنا دیا ہے۔ ایسے حالات میں عوام کو ایسے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو جدوجہد کی تلخیوں کو زندگی کا انعام قرار دے جو درد کے فاصلوں میں چند قدموں کی کمی پر فخر کرنا سکھائے۔ جو گر گر کر بڑھنے کا حوصلہ دے جو جاں نثاروں کو کہیں اماں نہ ملنے کی دعا مانگے اور جو جلالِ فرقِ سرِدار کو نظر نہ لگنے دے۔ میں صرف شاعروں کی بات نہیں کرتا۔ لیکن کیا شعراء کیا نثر۔ میں کسی ایسے پاکستانی ادیب کا نام نہیں لے سکتا جس نے مشکل ترین حالات میں فیض کی طرح تبدیلی کی امید کی شمع روشن رکھی ہو اور کشمکش کی صعوبتوں کو کامرانی کا درجہ دے کر اپنے ہموطنوں کا حوصلہ بلند کیا ہو۔

ہو سکتا ہے آپ کو کسی وجہ سے یہ خیال آیا ہو کہ میں فیض کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھ سکتا ہوں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ جو لوگ فیض کو بہت جانتے تھے وہ بھی کم جانتے تھے۔ ان کی شخصیت کا سحر بیان کرنا آسان نہیں۔ میں اس مختصر تحریر میں اُن کی شخصیت کے صرف ایک پہلو پر توجہ مبذول کرنا چاہوں گا۔

وفات سے تقریباً تین ہفتے پہلے فیض نے پوئٹری فورم کے ایک اجلاس میں جدید عرب شعراء کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ہموطن شاعروں اور ادیبوں سے گلہ کیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ "بوریت" کا

شکار نہ ہو۔ یہ گویا یہ سرزنش، یہ دعوتِ عمل فیض کا حق تھا، کیونکہ وہ خود بھی "بوریت" کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ دن یاد کیجیے جب فیض نے "دستِ صبا" کا ۱۹۵۲ء ابتدائیہ لکھا تھا۔ اس وقت ابھی "راولپنڈی سازش کیس" کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ جسے راولپنڈی سازش کیس اس لیے کہا جاتا درست ہے کہ یہ چند بے گناہوں کو سزا دینے کی سازش تھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ فیض کو کب آزادی نصیب ہوئی۔ ہو گی بھی یا نہیں۔ ان حالات میں فیض نے کہا

"حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق
شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔
فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔
یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں
اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔ اس کوشش میں کامرانی
یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استطاعت پر ہے۔ لیکن کوشش میں مصروف
رہنا بہرطور ممکن بھی ہے اور لازم بھی .... کوشش کیسی بھی حقیر کیوں نہ
ہو، زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے۔"

فیض دار پر بھی "بوریت" کا شکار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ بیس برس بعد (۱۹۸۲ء) فیض ایسے بیمار ہوئے کہ دو تین دن بہت ہی سخت مقام آئے، ذرا طبیعت سنبھلی تو کہا۔

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو تو اک عمر پڑی ہے

فیض کی لغت میں "بوریت" کے معنی ہیں "زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری" اور فیض نے "بوریت" سے بچنے کے لیے جو نسخہ عمر بھر استعمال کیا وہ ان کے اس اعلان نامے میں درج ہے جو انہوں نے ساٹھویں دہائی کے اواخر میں ادیبوں کے لکھا تھا۔ جسے انہوں نے ستر ہویں دہائی کے اواخر میں دوبارہ جاری کیا اور جو آج بھی مستند ہے۔

"ہمارا ایمان ہے کہ
تمام سنجیدہ اور موثر ادب کی تخلیق کے لیے ادیب کا کومیٹڈ COMMITTED
ہونا بنیادی شرط ہے۔ وہ ادیب اپنی ذات اور اپنے فن کے ساتھ
کومیٹڈ COMMITTED ہے۔ اس کیلئے لازم ہے کہ وہ مومن ہے یا

موقع پرستی کی خاطر اپنا مسلک ترک نہ کرے۔ ان مصلحتوں کی خاطر جو اس کی اپنی نہیں اور ان خارجی احکامات کی خاطر جنہیں وہ آزادانہ طور پر قبول نہیں کر سکتا اپنے تجربے کو مسخ نہ کرے۔ نہ اپنے ذہن کو بے وفا بنائے۔

ادیب اپنے ملک اور اپنے عوام کے ساتھ COMMITTED. ہے۔ ایک راہبر، فلسفی اور دوست کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ ان ہی کی رہنمائی کرے جہالت، ضعیف الاعتقادی اور تعصب کے اندھیروں سے علم کی روشنی کی طرف، ظلم کی مجبول جبیوں سے آزادی کی شاہراہوں کی طرف، ذاتی یاس کے چنگل سے اجتماعی امید کی منزل کی طرف۔

ادیب COMMITTED ہے مجموعہ نوع انسانی کے ساتھ۔ اس کیلئے لازم ہے کہ خود بھی معاملات کو سمجھے اور اپنے قارئین کو پوری دنیا میں دوست اور دشمن کی شناخت کرا سکے۔ ان لوگوں کو جو ایک منصفانہ سماجی نظام کے ذریعے اپنے ہم نفسوں کو آزاد کرانے، دنیا میں دستاز کرانے علم و دانش سے بہرہ آور کرانے اور ان کی زندگی میں آسودگی بھرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور ان لوگوں کو جو اپنے اقتدار اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد کو دوام دینے کی غرض سے کمزور اور کم خوش قسمت انسانوں کو غلام بنانے، ان کا استحصال کرنے، انہیں ذلیل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

مراد یہ کہ آج پاکستان میں ہر سنجیدہ ادیب کا فرض ہے کہ وہ کھل کر بلا خوف و خطر، اپنے بنیادی حق اظہار کا حق چاہی نہ کرے بلکہ اسے تمام پرانی زیادتیوں اور نئی ناانصافیوں، کج روی، گمراہی اور ہر قسم کی سماجی، سیاسی، فکری بے ایمانی کی مذمت کے لیے بروئے کار لائے۔

اور مراد یہ ہے کہ

آج کی دنیا میں سنجیدہ ادیب کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام سامراجی نیا پرست اور نو آبادیاتی قوتوں کی مذمت کرے۔ اور مشرق و مغرب میں ان تمام لوگوں سے محبت، احترام اور تعاون کا رشتہ استوار کرے جو آزادی اور بنیادی

توجہ اور انسانی حقوق کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ اس کے لیے لازم ہے
کہ وہ اپنے قلم سے سامراجی طاقتوں کے خلاف بند باندھ دے۔ جو
انسانیت کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اپنے قلم کو ان قوتوں
کا علم بنا دے جو نوع انسان کو عالمی آزادی اور عالمی امن کی منزل سے
ہمکنار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

فیض کی نظر میں "بوریت" کا علاج تھا۔ کمٹ منٹ کا احترام
اور اس پر عمل اور یہی میرے نزدیک ان کی شخصیت کا اہم ترین پہلو ہے۔
فیض نے ادیب کا کمٹ منٹ کے تین دائرے گنوائے ہیں
کمٹ منٹ اپنی ذات اور فن سے۔ اپنے ملک اور عوام سے۔ نوع انسانی سے۔ اس عہد کی پاسداری

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں، راحت تن، صحت داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی
اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پس زنداں، کبھی رسوا سر بازار

اور پھر جس شخص کے دل میں ہر داغ ہو، بجز داغ ندامت اور جو یہ کہہ سکے۔

ہم اپنے وقت میں گزرے جہان گزراں میں
نظر میں مات لیے، دل میں آفتاب لیے

ایسی شخصیت کا صحیح احاطہ کرنے کے لیے بہت سا وقت چاہیئے۔ اور بہت سے اعلیٰ ذہن پہلے
ہم "بوریت" کے جال سے تو نکلیں۔ پھر شاید یہ احساس ہو جائے کہ فقط عہد فیض میں بغیر جیئے زندہ رہنا
تو کوئی بات نہیں اور پھر شاید فیض کو یہ پانا بھی آسان ہو جائے
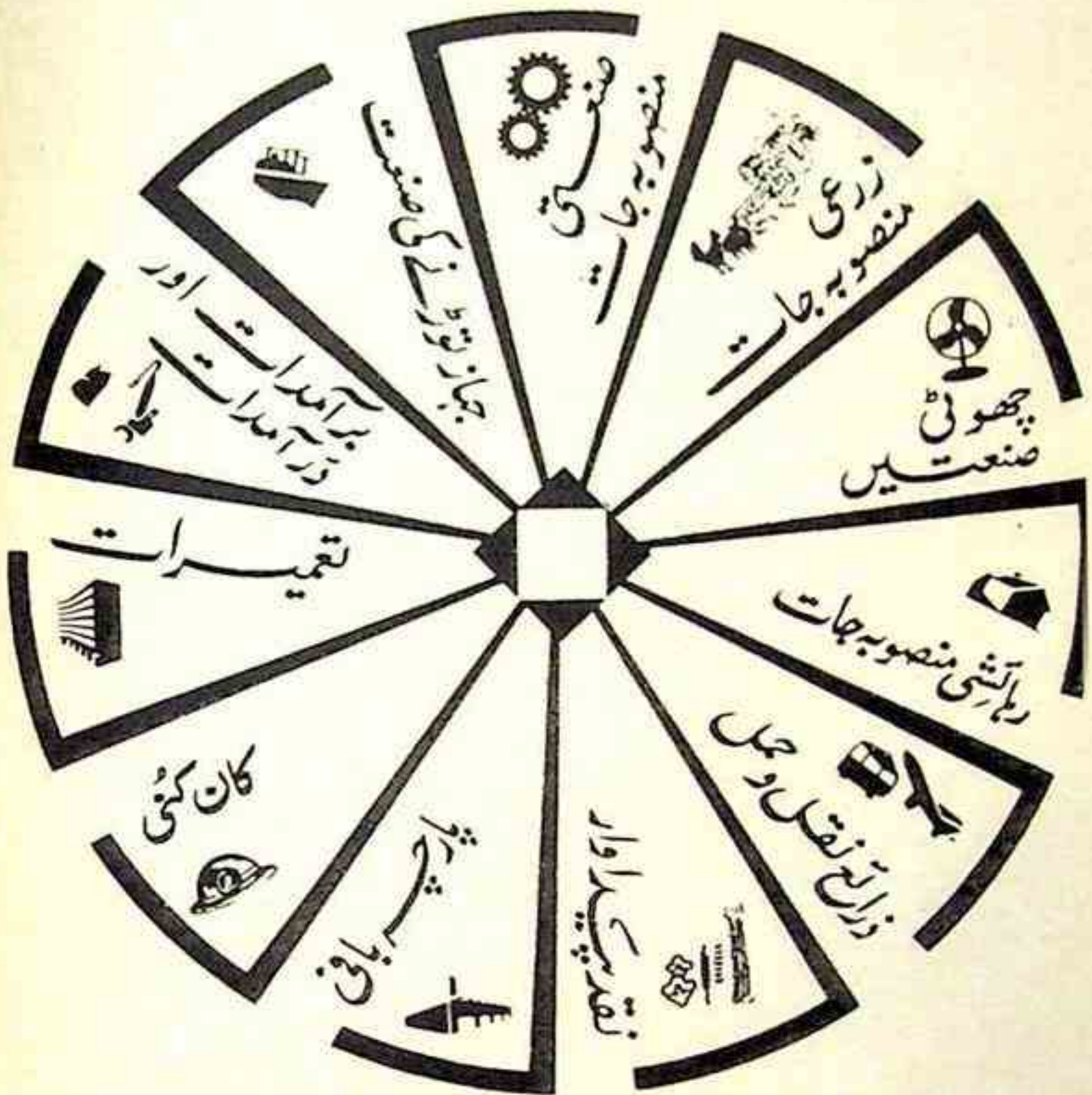
رام لعل

فیض کی مقبولیت اور جیل

اصولاً یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ قومی یا بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کے جیل جانا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن کئی بڑی شخصیتوں کی عوامی مقبولیت کا سلسلہ ان کے سلاخوں کے پیچھے چلے جانے کے بعد ہی شروع ہوا ہے۔ سیاسی لوگوں کے بارے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ انگریزی راج کے خلاف آزادی کی جدوجہد کرنے ہی کے نتیجے میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ کئی دوسرے رہنماؤں کو شہرت ملی جبکہ محمد علی جناح یا ڈاکٹر محمد اقبال کو ایک بار بھی جیل کا منہ نہیں دیکھنا پڑا اور وہ دونوں بین الاقوامی سیاست میں ایک خاص ردعمل کی بدولت اور انگریز کی سازش کی وجہ سے قدم بہ قدم اُس مقام کو پا گئے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اپنی شعری نظریات، اور تصور پاکستان کا خاکہ پیش کرنے کے سبب سے اپنی شناخت پا گئے۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ انہی اقبال نے سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا، لکھ کر آزادی کی جدوجہد میں ایک دبی دبی سی لیکن کبھی نہ بجھنے والی آگ پھونک دی تھی اور اس نظم کو آج ہمارے ملک میں ایک قومی ترانہ کا سا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ بہر حال اس منطق کی حمایت اور مخالفت میں کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور اس وقت ہمارا کام فیض احمد فیض کے عوامی سطح پر مقبول ہو جانے کے بنیادی اسباب کا پتہ لگانا ہے۔

مجھے یہ بات تو ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم کہ فیض نے پہلی نظم یا غزل کب لکھی تھی لیکن یہ پتہ ہے کہ وہ کالج کے زمانے میں شاعری کر رہے تھے۔ یعنی جب وہ بی اے میں زیر تعلیم تھے۔ اور اسی زمانے میں انہوں نے اشتراکی نظریات قبول کر لیے تھے

کالج ہی کے زمانے میں انہوں نے ایک بار ڈاکٹر محمد اقبال کے سامنے اپنا کلام سنایا تھا اور ڈاکٹر اقبال نے انہیں بہت داد دی تھی۔ پھر برسوں بعد اقبال کی شاعری کے بارے میں اپنی یہ رائے دی تھی ــــ "جہاں تک شاعری میں حسی ہلچل SENSIBILITY. زبان اور اس کی موسیقیت کا تعلق ہے ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہیں۔ علامہ اقبال، بہت بڑے شاعر ہیں۔ اگر وہ اشتراکیت کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا"۔

دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی تھی جو ۱۹۴۵ء میں جاکر ختم ہو سکی۔ یونیورسٹی کی تعلیم پوری کر کے فیض امرتسر کے ایک کالج کے مدرس بن گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ لاہور چلے گئے۔ وہاں بھی ایک کالج میں پڑھا رہے تھے کہ ایک روز اپنے ایک دوست میجر مجید ملک کے کہنے پر وہ فوج میں ملازمت پانے کے لیے ایک کرنل بیرڈ کے سامنے انٹرویو کے لیے پیش ہوئے۔ کرنل بیرڈ کے دل میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ انہوں نے فیض احمد فیض کے سامنے ایک سرکاری فائل کا راز بتاتے ہوئے کہا ــــ "اس میں درج ہے کہ تم کمیونسٹ ہو"۔ جب فیض نے کہا ــــ "میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہوں"۔ تو کرنل نے یہ کہہ کر ذرا خیال رکھنا، انہیں ملازمت میں لے لیا۔ اس بات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ فیض کے خیالات کالج کے زمانے سے ہی اشتراکی نظریات کے حامل ہو چکے تھے۔

۱۹۴۱ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام "نقش فریادی" لاہور سے شائع ہوا تھا۔ باقر مہدی نے لکھا ہے ــــ "یہ مجموعہ کلام ایک آندھی کی طرح چھا جانے کے بجائے آگ کی طرح رفتہ رفتہ شاعری کے حلقوں میں مقبول ہوا۔ اتنا کہ اس زمانے کے ہر نئے شاعر پر فیض کی آواز کا دھوکا ہوتا تھا"۔ باقر کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ فیض کے پہلے مجموعہ کلام کے آجانے کے بعد اس کے کئی آف شوٹس OFF SHOOTS. سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور بہت بعد میں ظہیر کاشمیری، کرشن ادیب، تیغ الہ آبادی۔ مصطفےٰ زیدی، وغیرہ بھی اسی ڈگر پر چلتے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ فیض کی شاعری کے اثرات شاعروں کے علاوہ بعض نثر نگاروں پر بھی پڑے کہ انہوں نے ان کی نظموں کے کئی مصرعوں سے اپنی کہانیوں کو عنوانات کی حد تک فکر انگیز بنایا۔ بعض نے اپنی پوری

پوری تخلیقات کے لیے ان ہی کے اشعار سے بنیادی خیال مستعار لے لیا۔ اُپیندر ناتھ اشک کے ناول گرم راکھ' جو ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا اس میں ان کی پہلی نظم کی گونج صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ ن۔م۔ راشد نے نقشِ فریادی' کے دیباچے میں اس بات کی بشارت دی تھی ـــــ نقشِ فریادی ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔

فیض کی مشہور نظم جسے کئی گلوکار گا چکے ہیں ـــ مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' اسی مجموعے کی پہلی نظم تھی۔ یہ نظم ایک جذباتی نوجوان و دانشور شاعر کی اندرونی کش مکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہے۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں میں سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ فیض جتنا عرصہ فوجی ملازمت میں رہے۔ کچھ نظمیں اسی دوران میں بھی لکھیں۔ جیسے ـــــ تیرگی ہے کہ اُمڈتی ہی چلی آتی ہے' پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے' میرے ہمدم میرے دوست اور سیاسی لیڈر کے نام ـــ جو گاندھی جی کے بارے میں تھی۔ پھر ۱۹۴۶ء میں فیض نے فوج کی ملازمت چھوڑ دی۔ ان کے لیے پاکستان ٹائمز میں ایڈیٹر کی جگہ بھی خالی تھی۔ یہ اخبار ابھی نکلنا شروع نہیں ہوا تھا اور کانگریس و مسلم لیگ کی ملی جلی سرکار (انٹیرم گورنمنٹ) میں بھی کوئی جاب قبول کرنے کا مسئلہ تھا جو وزارت خارجہ کے محکمے میں خالی تھی۔ وزیر داخلہ سردار پٹیل سے ان کے ڈپٹی سیکرٹری نے فیض احمد فیض کی سفارش کی ہوئی تھی۔ لیکن فیض فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں لے پا رہے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہو گئی اور وہ دہلی چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ لیکن یہاں فیض سے متعلق ۱۹۴۶ء کے ایک اور واقعے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جامعہ

ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی تقریب منائی جا رہی تھی۔ اس موقعہ پر جو مشاعرہ ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) نے کرایا اس کے اسٹیج پر انہوں نے گاندھی جی اور مسٹر محمد علی جناح کو بھی یکجا کر دیا تھا۔ وہاں فیض بھی مدعو تھے۔ جوش، جگر، فراق وغیرہ کے ساتھ۔ اسی مشاعرے میں فیض نے گاندھی جی کے بارے میں اپنی نظم سیاسی لیڈر کے نام، سنائی تھی۔ جس پر انہیں خاطر خواہ داد نہیں مل سکی۔ اس زمانے میں انہیں جوش، جگر اور فراق کے مقابلے میں بڑا شاعر نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ باقر مہدی لکھتے ہیں :- "اس زمانے میں ظہیر، سردار جعفری، مجتبیٰ حسین جیسے نقاد انہیں خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یعنی اُن کی نظر میں شاعروں کی دوسری صف میں کیفی اعظمی زیادہ اچھے شاعر تھے۔ مجتبیٰ حسین تو سردار جعفری ہی کے گن گایا کرتے تھے۔

آزادی کے بعد فیض نے جب اپنی مایوسی کا اظہار اس نظم میں کیا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا وہ یہ سحر تو نہیں

تو سردار جعفری نے یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑایا کہ یہ نظم آر۔ ایس۔ ایس والے اور مسلم لیگی دونوں کہہ سکتے تھے۔

۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس میں جب فیض جیل میں ڈال دیئے گئے تو ان کے ساتھ کئی دوسرے لوگوں کے علاوہ سجاد ظہیر بھی تھے۔ ان دونوں کا ساتھ ۵۵ء تک رہا۔ یہیں سے فیض کی حقیقی مقبولیت کا آغاز ہوتا ہے جو قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر تھی۔ سجاد ظہیر نے جیل سے جو بیشمار خط اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کو لکھے ہیں ان میں، فیض کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ ان خطوط سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ فیض جب بھی کوئی نئی نظم لکھتے تھے تو جیل کے اندر اس خوشی میں ایک جشن سا منایا جاتا تھا۔ اس سے متعلق خبروں کے علاوہ ان کی نظمیں جیل سے باہر بھی کسی نہ کسی ذریعے سے یقیناً پہنچ جاتی تھیں جنہیں پاکستان وبھارت کے ترقی پسند رسالے ایک بیش قیمت تحفے کے طور پر چھاپ لیتے تھے۔ جیل کے باہر ان کی شہرت دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ان کے اوّلین مجموعہ کلام نقشِ فریادی کے پانچ ایڈیشن چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گئے تھے۔ لاہور جیل میں قید کے دوران فیض کے ایک دانت میں شدید درد رہنے لگا تھا جس کے علاج کے لیے

انہیں کپڑے پہرے میں جیل کے باہر ایک ڈاکٹر کے کلینک میں لے جایا جاتا تھا۔ ایک دفعہ وہاں سے جانے کے لیے گاڑی کا بندوبست نہ کیا جا سکا تو انہیں تانگے میں سوار کر کے لے جایا گیا۔ ان کے دونوں طرف اور آگے بھی بندوق بردار سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس روز کا قصہ خود فیض کی زبانی سنیے ۔۔۔

"ہم لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ لاہور ہمارا تماشا دیکھ رہا تھا پھر لوگوں نے ہمیں پہچان لیا۔ بازار میں ہمارا تانگہ گھرا تھا اور اس کے ارد گرد یارانِ وفا کا ہجوم۔ اس میں نانبائیوں سے لے کر معروف صحافیوں تک سبھی شامل تھے۔ بالکل جلوس کی شکل بن گئی۔ میں نے زندگی میں ایسا دلکش جلوس نہیں دیکھا۔ اسی سے متاثر ہو کر میں نے یہ نظم لکھی"۔

آج بازار میں پابہ جولاں چلو۔ دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک بہ سر چلو، خوں بہ داماں چلو۔ راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

فیض کو ۱۹۵۸ء میں بھی جیل جانا پڑا تھا۔ جب جنرل ایوب خاں نے ملک میں پہلی بار فوجی نظام قائم کیا تھا۔ جیل میں رہ کر فیض نے کئی نظمیں لکھیں جو "زنداں نامہ" اور "دستِ صبا" نام کے مجموعوں میں شائع ہوئیں۔ جیل میں انہی کی حوصلہ افزائی سے ان کے ساتھی قیدی چھوٹے چھوٹے مشاعرے بھی برپا کر لیتے تھے۔ میجر جنرل اکبر خاں، میجر جنرل نذیر احمد، ویر کموڈر محمود خاں جنجوعہ، بریگیڈیر صدیق خاں، بریگیڈیر لطیف خاں، لیفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب، لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین، میجر اسحٰق محمد، میجر حسن خاں، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، کیپٹن خضر حیات، سید سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیے گئے ان کے ساتھیوں میں تھے۔ ظفر اللہ پوشنی نے لکھا ہے کہ ہم سب جب مقدمے کی پیشی کے لیے عدالت جاتے تھے تو آتے جاتے ہوئے فیض کا جیل ہی میں لکھا ہوا یہ ترانہ گایا کرتے تھے۔

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

مختلف جیلوں میں لکھی گئیں فیض کی کئی نظمیں بہت مشہور ہوگئیں۔ بلکہ ان کے ترجمے بھی کئی سوشلسٹ ممالک میں کیے جاچکے ہیں اور ان کی اہمیت نہ صرف عوام میں ہے بلکہ ادب میں بھی انہیں پورا پورا احترام ملا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی قید و بند کی نظموں کے بارے میں لکھا ہے ۔۔۔ "فیض کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملی ہے مگر اس نے انہیں جھلسایا نہیں، بلکہ ان کی شخصیت کو قوت اور ان کی شاعری کو تب و تاب بخشی ہے"

صدر ایوب کی سخت پابندیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر فیض نے نظمیں لکھی تھیں:

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے .....

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
مگر گزرنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں .....

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پہ بکھر گئی ہوگی .....

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، ملاقات، زنداں کی ایک صبح، زنداں کی ایک شام، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، وغیرہ کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں دردمندی بھی ہے اور ایک نئی صبح کی آس بھی۔ اپنے ملک پر فوجی نظام کی لگائی ہوئی اظہار کی پابندیوں کی طوالت سے نراش ہوکر وہ کہہ اٹھے۔

تماعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے ....

ایک دور ایسا آیا کہ فیض پاکستان چھوڑ کر کبھی روس، کبھی بیروت، کبھی لندن، کبھی کینیڈا میں برسوں تک گھومتے پھرے۔ اپنے ملک سے باہر رہ کر بھی انہوں نے بے شمار نظمیں تخلیق کی تھیں ——— کہاں جاؤ گے، شام، یہاں سے شہر کو دیکھو، دعا، لہو کا سراغ، سوچنے دو، ہم تو مجبور تھے اس دل سے، پاس رہو، ہارٹ اٹیک، غم نہ کر، غم نہ کرو وغیرہ۔

یار لوٹ آئیں گے، دل ٹھہر جائے گا، غم نہ کر
زخم بھر جائیں گے، غم نہ کر
دن نکل آئے گا، غم نہ کر
رت بدل جائے گی، غم نہ کر

۱۹۷۸ء میں وہ بھارت آئے تو انہوں نے ایک نظم "دل من مسافرِ من" لکھی تھی جو یہ ہے:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشناساں
ہمیں دن سے رات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا !

اور فیض جب اپنے گھر لوٹے تو اس مرتبہ کسی نے انہیں گرفتار تو نہ کیا لیکن وہ اچانک چل بسے اپنے وطن کی گلیوں پر نثار ہو گئے۔ اور ایسا کر کے وہ اردو ادب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے احتجاج اور فریاد کی ایک زندہ و پائندہ علامت بن گئے۔

غالب احمد

فیض کا مقامِ غزل

ہمارے ایک بہت ہی محترم اور شفیق اُستاد جناب پروفیسر خواجہ منظور حسین نے اپنی کتاب "اُردو غزل کا خارجی روپ بہروپ" میں غزل میں داخل اور خارج کی بحث کو اردو غزل کی تاریخ کے حوالے سے بہت محنت اور عرق ریزی سے لیکن بہت ہی خوش اسلوبی سے اور موزوں انداز میں سلجھایا ہے۔ اُن کی اِس کتاب سے بہت حد تک اُردو کے پُرانے مخمصے یعنی "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" سے بھی چھٹکارا ہو جاتا ہے۔ یہ بحث بھی کتنی عبث تھی۔ غزل کی صنف پر اُن کی اِس سیر حاصل تحقیق سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ غزل کا وہ روپ جسے فی الحقیقت تخلیقی کہا جا سکے عصری زندگی کی نہ صرف بھرپور عکاسی ہے۔ بلکہ پچھلی دو صدیوں میں خصوصاً صرف غزل ہی وہ صنف ہے جس نے یہ کام پُر اثر طور پر سرانجام دیا ہے۔ دوسری اصناف یعنی نظم، افسانہ اور ناول اپنی عمر کے لحاظ سے اتنے صغیر تھے کہ اِس سلسلہ میں اُن سے کوئی بڑا کام ہو نہیں پایا۔

لیکن اُن کی اِس کتاب سے یہ تاثر بھی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے کہ کیا ادب زندگی کا محض عکاس ہی ہوتا ہے۔ اور اُس کے خارجی روپ بہروپ محض زندگی کی عکاسی ہی کرتے ہیں۔ اِس نقطۂ نظر سے ایک خرابی کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے اور ہوئی بھی ہے جس نے ترقی پسند تحریک کو اردو ادب میں بہت نقصان بھی پہنچایا۔ ترقی پسند تحریک جو اُردو میں ادبی تخلیق کا پرچم لیکر اُٹھی تھی، ایک حد تک جلسے، جلوس اور ادبی صحافت کی نذر ہو گئی۔ ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو اُن کے سماجی پس منظر میں صحیح طور پر نہ سمجھا گیا نہ پرکھا گیا :۔

دراصل کسی معاشرے یا قوم کا اپنی مخصوص جغرافیائی حدود میں ایک تہذیبی تمدنی اور معاشرتی پس منظر ہوتا ہے۔ اِس پس منظر کے حوالے سے اُس معاشرے کی زبان اور ادب نہ صرف معرضِ وجود میں آتے ہیں بلکہ اسی ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔ لیکن معاشرے کی تہذیب تمدن اور معاشرت کے وہ محض عکاس نہیں ہوتے۔ اِس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو پچھلے کم از کم دو سو سال کے عرصہ میں برصغیر میں جو تہذیبی اور تمدنی ارتقا کے ساتھ ردوبدل اور شکست و ریخت کا عمل ظہور پذیر ہوا ہے اس کی جھلک تو ہم اردو غزل میں دیکھ سکتے ہیں لیکن اس جھلک کو ہم ظاہر کا عکسی روپ قرار نہیں دے سکتے اور اُردو غزل کو محض اس کی عکاسی نہیں۔ عکاسی کا کام کسی معاشرے یا ملک کی زبان کی دوسری اصناف کے ذمے تو سونپا جا سکتا ہے مثلاً تاریخ۔ صحافت۔ اظہارِ سیاست اور دیگر ایسے ہی کام جو کہ ایک حد تک اظہار اور ابلاغ کے وسائل اور ذرائع قرار پا سکتے ہیں لیکن ادبی تخلیق نہ تو محض عکاسی کا کام کرتی ہے اور نہ ہی اِسے صرف ذریعہ اظہار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس میں باطنی اور ظاہری اطراف سے تخلیقی عناصر جن میں ایک طرف صناعی اور ایجاد کے محرکات کام کرتے ہیں اور دوسری طرف شعوری اور غیر شعوری سطح پر دریافت اور بازیافت کا عمل پیہم رواں رہتا ہے اُسے ایک تجدیدی عمل بنا دیتے ہیں :

اُردو غزل میں بھی ہمیں جو زندگی کی جھلک نظر آتی ہے ہم اُسے عصری عکس سمجھ کر بہت سے دھوکے کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس عصری جھلک میں معاشرے کی تصویر نہیں ہوتی بلکہ اُس کا ایک ایسا تصور ہوتا ہے جس میں توصیف و تنقید کے ساتھ تخریب اور تجدید دونوں شامل ہوتے ہیں۔ زبان معاشرے کی شکست و ریخت کے تاریخی اور جغرافیائی عوامل سے اور اس کے مختلف طبقات کے گرد ہی شعور اور لاشعور کی باہم آمیزش اور آویزش سے پرورش پاتی ہے۔ اور از خود نہ صرف ذریعہ اظہار بنتی ہے بلکہ وسیلۂ احتساب کا بھی کام دیتی ہے۔ اور خصوصاً غزل کی صنف میں ادبی زبان کا استعمال اور اس کی کم از کم پچھلے دو سو سال کی تاریخ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اردو غزل کا اپنا ایک الگ تہذیبی تمدنی اور معاشرتی پس منظر اور مزاج ہے۔

اردو ادب میں غزل کے مزاج کی نوعیت کا بنیادی فرق اردو نظم کے ساتھ موازنہ کرنے سے زیادہ واضح ہوتا ہے۔ دونوں کے مزاج بہت حد تک الگ ہیں۔ یہ فرق اردو ادب

ہیں فارسی زبان کی تہذیبی تاریخ کے حوالے سے آیا ہے۔ غزل کا بنیادی جذبہ عشق اور محبت ہے۔ (عشق اور محبت اپنے تمام لغوی امکانات کے ساتھ) ۔عشق اور محبت سے وابستہ تمام جذبات اور محرکات غزل میں عموماً موجزن نظر آتے ہیں۔ جذبۂ تسخیر و سپردگی، قصۂ فراق و وصال، احساسِ طرب و سکون، بیانِ درد و دام، دشتِ طلب سے وابستہ تمام ہیجان اور اضطراب غزل کے موضوعاتِ سخن بنتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف نظم کا بنیادی جذبہ ضرورت ہے۔ چاہے وہ قصیدہ ہو۔ مثنوی یا مرثیہ یا پچھلے سو سال کی نظمیہ ہیئت (جس میں جدید اور قدیم نظم کی تمام اشکال کو شامل کیا جا سکتا ہے)۔ نظم کا موضوعِ سخن جذبۂ ضرورت سے پھوٹتا ہے۔ یہ ضرورت معاشرتی بھی ہو سکتی ہے اور نظریاتی بھی اور ہنگامی اور جذباتی بھی۔ نظم میں عموماً ایک کیفیت اضطرار اور احساسِ ضرورت ہوتا ہے۔ جو اس کے موضوع کا محرک بنتا ہے۔

دراصل اگر ادب کے بنیادی محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو پانچ بنیادی محرکات سامنے آتے ہیں۔ ان محرکات میں باطنی اور خارجی عناصر دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یہ پانچ محرکات (۱) محبت (۲) نفرت (۳) حیرت (۴) ضرورت (۵) صنعت قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ شاید یہ بات کچھ اجنبی اور انوکھی لگے اور بعض طبیعتوں پہ گراں بھی گزرے۔ لیکن ذرا دور رس نظر سے ان محرکات کا مطالعہ کیا جائے تو ادب پر بحیثیت مجموعی اور خاص طور پہ شاعری کے حوالے سے مختلف اصنافِ سخن پہ گہرے مطالعے کی گنجائش ضرور نکلتی ہے اردو زبان میں بھی ادبی تخلیق کے بنیادی محرکات یہی رہے ہیں۔

کیونکہ یہاں بات اردو غزل کی ہو رہی ہے۔ اس لیے اردو غزل کے حوالے سے اگر برصغیر کی ادبی تاریخ کا مختصر سا جائزہ لیا جائے تو مندرجہ بالا محرکات کی روشنی میں اردو غزل کے بدلتے ہوئے روپ اور بہروپ سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اردو غزل فارسی کی ادبی تہذیب سے نمودار ہوتی ہے۔ اور فارسی زبان کی ادبی تہذیب میں محبت اور عشق کے فکری اور جذباتی پس منظر میں پرورش پاتی نظر آتی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ برصغیر کی اندرونی زبانوں کی تہذیب خصوصاً ہندی اور سنسکرت کی آمیزش سے اردو غزل کی تہذیب اور تمدن میں فرق نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔ فارسی اور عربی ادب میں محبت اور عشق کا فرمانروا مرد کی ذات ہے۔ اس کے برعکس ہندی ادب میں عشق اور محبت کی مملکت کی مالک عورت ہے۔ خصوصاً شاعری کے حوالے سے ہندی ادب میں محبت اور عشق ایک نسوانی جذبہ ہے۔ اس کے برعکس فارسی اور عربی ادب

میں محبت اور عشق میں ایک جذبہ مردانگی ہے۔ اس لیے ہندی اور فارسی شاعری میں محبت کی شاعری کا لہجہ بالکل مختلف ہے۔ اردو غزل کے ابتدائی دور میں فارسی غزل کی تہذیب زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اُردو غزل کے تاریخی پس منظر میں محبت اور عشق کی داستان اور اس کے اظہار کے اسلوب بتدریج بدلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہندی ادب اور فارسی ادب اُردو غزل کو دو دھاروں میں تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔

اردو غزل کے تاریخی پس منظر میں تین بڑے دور نظر آتے ہیں۔ پہلا دور میرؔ اور غالبؔ کا ہے۔ میرؔ کے ہاں محبت اور عشق اپنے باطنی اور ظاہری محرکات کے ساتھ ہندی ادب کی تہذیب سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ جس میں محبت بہت حد تک اپنے نسوانی روپ میں نظر آتی ہے۔ یعنی مہجور و مجبور مستور و غلطاں مسلسل ایک کیفیت درد و اضطراب اور لگاتار ایک شب گزیدگی کا عالم۔ دوسری طرف غالبؔ کے ہاں محبت اور عشق کی ایک فعالی کیفیت ہے۔ شعور کی بیداری حواس کا نفاذ۔ رنج والم کے اظہار میں بھی ایک خاص زور و شور اور ایک کیفیتِ مردانہ نظر آتی ہے۔ عشق و محبت کا جذبہ غالبؔ کے ہاں "ظاہر" اور باہر کی طرف پھیلتا نظر آتا ہے۔ ادھر میرؔ کے ہاں یہ "باطن" اور "اندر" کی طرف جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ میرؔ کے ہاں عشق و محبت میں ایک کیفیت مجذوبانہ ہے۔ غالبؔ کے عشق و محبت کی کیفیت صوفیانہ اور فلسفیانہ ہے۔ وہ اپنے باطن کو لے کر ظاہر کی طرف سفر کرتا نظر آتا ہے۔ میرؔ اپنے ظاہر اور اردگرد کی دنیا کو لے کر باطن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

غالبؔ کے ہاں ؎ بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

لیکن میرؔ کے ہاں ؎ "نگاہ غور سے کر میرؔ سارے عالم میں
عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی"

اُردو غزل کے اس دور میں میرؔ کے اردگرد سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ اور دوسرے شاعر اور غالبؔ کے ساتھ ذوقؔ، مومنؔ، آتشؔ، ناسخؔ، اور بہادر شاہ ظفرؔ اور دیگر شعراء کے کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو اردو غزل کے اس داخلی اور خارجی پہلو کا اظہار بخوبی نظر آتا ہے۔ کچھ شاعر میرؔ کے ہمنوا نظر آتے ہیں تو کچھ غالبؔ کے دمساز۔ اردو غزل کے دوسرے اہم دور کی ابتدا، بہادر شاہ ظفرؔ کے ساتھ غالبؔ اور میرؔ کا دور رخصت ہوتا نظر آتا ہے۔ اور

مولانا حالی، داغ دہلوی، علامہ اقبال، امیر مینائی اور پھر یاس یگانہ اور حسرت موہانی ابھرتے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں مغربی تہذیب اور مغربی ادب بھی اُردو ادب اور اُردو غزل پر اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہاں محبت اور عشق کی داستان ظاہر و باطن کے تمام جذباتی عناصر کے ساتھ غمِ روزگار کی چادر اوڑھے ہوئے دشتِ طلب میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ غزل کے اِس سنگھم پر ادب کے چاروں محرکات مختلف رنگوں اور پیراؤں میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں غزل میں محبت بھی ہے نفرت بھی ہے۔ حیرت بھی ہے اور ضرورت بھی ہے کیونکہ اردو غزل جس دور سے گزر رہی تھی اُس کا طبعی تقاضا تھا کہ محبت کے ساتھ نفرت کو بھی جگہ دی جائے اور حیرت زدہ ہوتے ہوئے ضرورت کا احساس بھی کیا جائے۔ اِس دوسرے دور میں غالب کا نقطۂ شعری اور اسلوبِ بیان صورتِ حال کی مناسبت سے زیادہ مقبول نظر آتا ہے مغرب کی تہذیبی یورش سے دوچار ہو کر حالی اور آزاد نے اُردو میں نئے اسلوب کو وضع کرنے کی کوشش کی۔ حالی نے غزل کو ایک نیا خارجی اور تہذیبی روپ دینے میں بنیادی کام کی ابتدا کی۔ لیکن جب صورتِ حال سے وہ دوچار تھے صنفِ غزل سے انہیں اپنی انبساط کے مطابق کوئی خاص مدد نہ ملی۔ حالی کے بعد اقبال نے غالب کے شعری اسلوب اور حرفوں کے "ظروف" کو اپنے رنگ میں فارسی ادب کی تہذیب کے حوالے سے استعمال کیا اور غزل میں کسی حد تک نئے اسلوب کی تلاش میں کامیاب رہے۔ لیکن ان کی نظر میں مسلم معاشرے کی جو صورتِ حال تھی اُس کے لئے صنفِ غزل ان کا ساتھ دیتی نظر نہ آئی۔ اِس لئے وہ نظم کی طرف مائل ہو گئے۔ لیکن اِس دور میں داغ، امیر مینائی، حسرت موہانی اور یاس یگانہ نے غزل کا دامن سنبھالے رکھا۔ اور ان کی ادبی کاوشوں کے صلے سے غزل کا چراغ جو کہ بظاہر مدھم پڑتا اور ٹمٹماتا نظر آتا تھا بجھنے نہ پایا۔

نظیر اکبر آبادی، حالی اور اقبال کے ایک ہمہ گیر ہنگامۂ نظم کے باوجود غزل کے تیسرے دور کی ابتدا ہوئی۔ جس کے ابتدائی دور میں مجروح، فانی جگر۔ جذبی اور اصغر گونڈوی سامنے آئے ان کے ساتھ ہی مجاز، فیض، فراق اور حفیظ جالندھری اور بہت سے دیگر غزل گو شعرا۔ اس دور میں غزل اور نظم کے درمیان کشمکش اپنے زوروں پر نظر آتی ہے۔ اس کشمکش کا خوبصورت اظہار فیض اور مجاز کے ہاں زیادہ اجاگر نظر آتا ہے۔ یہاں غمِ عشق غزل کی طرف کھینچتا ہے اور غمِ روزگار نظم کی طرف۔

اوپر کی ساری تمہید بے شک کچھ طولانی ہو گئی لیکن اس طولانی تمہید کا ایک مقصد تھا۔ دراصل غالب کے بعد داغ اور اقبال کے باوجود غزل اپنی توانائی کھو بیٹھی تھی۔ کیونکہ غزل کا کوئی ایسا نیا اسلوب اور کوئی ایسی نئی "صنعت" کوششوں کے باوجود کسی شاعر سے ایجاد نہ ہو سکی۔ جو غم عشق اور غم روزگار کی خلیج اور ان کی دن بدن بڑھتی ہوئی دوری کو غزل میں یکجا کر سکے اور ان کے امتزاج سے غزل کو ایک نیا مزاج بخش سکے۔ یہ کام اس دور میں اور کسی شاعر سے غالب کے بعد بطریق احسن انجام نہ پایا لیکن فیض نے نظم کو اپنانے کے باوجود اپنے قلبی واردات کا رخ ظاہر و باطن کے تمام اثرات کو قبول کرتے ہوئے غزل کی طرف رکھا۔ شاید کچھ لوگ اس حقیقت کے بیان سے سیخ پا ہوں کہ فیض اپنے ادبی تشخص کے حوالے سے غزل گو شاعر ہی قرار پائے گا۔ بہرحال غزل کی تاریخ میں فیض کا مقام غزل، غالب کے بعد اردو ادب کے خارجی اور باطنی تقاضوں کو ساتھ لے کر "غم عشق" اور "غم روزگار" کے حوادث سے دوچار ہوتے ہوئے ہماری موجودہ زندگی کے ہیجان خیز دور میں نہ صرف ایک مینارِ نور کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ فیض کے مقامِ غزل سے اردو ادب میں جدید غزل کے بیے امکانات اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ فیض کے ساتھ صنفِ غزل کے حوالے چند ایک اور غزل گو شعرا کو بھی زیر نظر رکھنا پڑے گا۔ ان کا ذکر اس مضمون میں کسی مناسب جگہ پر ضرور آئے گا۔

فیض کی غزل میں غالب کے بعد غزل کے تہذیبی اور تمدنی پس منظر میں ادب کے نئے تخلیقی وجدان کا ظہور ہوتا نظر آتا ہے۔ فیض کی غزل کے بھی تین دور ہیں۔ فیض کی غزل کے پہلے دور کو ہم ارتقائی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا دور تجدید غزل کا دور ہے۔ جس میں فیض نے روایت کے ساتھ ساتھ غزل کے نئے تقاضوں کو اجاگر کیا ہے۔ تیسرا دور فیض کی غزل کا دور ہے۔ جس کو غزل کی تاریخ میں غالب کے بعد مقامِ فیض کہا جا سکتا ہے۔

فیض کے ابتدائی دورِ غزل میں فیض کا شعری اسلوب غالب اور اقبال سے نہ صرف متاثر نظر آتا ہے بلکہ ان کے رنگ میں رنگا دکھائی دیتا ہے۔ نقشِ فریادی کی شروع کی غزلوں میں غالب اور اقبال کے لہجے کو تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

اس قسم کی غزلیں ہیں

حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز
دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

[illegible] کے معلوم

کون جانے کسی کے عشق کا راز

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے

میرے نالوں کی گم شدہ آواز

خوف ناکامیٔ امید ہے فیضؔ

ورنہ دِل توڑ دے طلسمِ مجاز

اس قسم کی غزلوں میں مضمون بندی کے علاوہ لفظوں کا لہجہ اور اسلوب شعر غالبؔ و اقبالؔ کے مِلے جُلے رنگ سے اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ اِس دور کی کچھ غزلوں میں غالب کا رنگ زیادہ نمایاں ہے اور کچھ غزلوں میں اقبال کا اور کچھ میں مِلا جلا۔ مثلاً اقبال کے رنگ کی غزلوں کے ایک دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

ہر حقیقت مجاز ہو جائے

کافروں کی نماز ہو جائے

دل رہینِ نیاز ہو جائے

بے کسی کارساز ہو جائے

منتِ چارہ ساز کون کرے

درد جب جاں نواز ہو جائے

عشق دِل میں رہے تو رسوا ہو

لب پہ آئے تو راز ہو جائے

ایک اور غزل:

دِل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا

سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا

شوقِ مجبور کو بس ایک جھلک دکھلا کر

واقفِ لذتِ تکرار نہ کر دینا تھا

یا پھر اسی طرح کی غزلیں:

موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا

کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

ناخدا دور ہوا تیز قریں کام نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا
عرصۂ دہر کے ہنگامے تہ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

اسی دور کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں بھی کہیں غالب اور کہیں اقبال کا رنگ کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً

ہمتِ التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی
اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی
اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

یا پھر اس قسم کے شعر

عشق منت کشِ قرار نہیں
حسن مجبور انتظار نہیں
اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں
فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

نقشِ فریادی کے اس دور میں فیض کے ہاں اقبال سے انا، نفس یا خودی کا شعور اور شکوہ اور شکایت کا بے دھڑک اظہار مستعار نظر آتا ہے۔ اور غالب کا شعری شعور اور بندشِ الفاظ یہ دونوں آگے چل کر فیض کے اپنے لہجے میں بھی موجزن نظر آتے ہیں۔ لیکن فیض کی غزل کے اگلے دوروں میں یہ عناصر فیض کی صناعی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ لیکن شروع کی غزلوں میں فیض پر ان کا رنگ زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ اس درمیانی دور میں کچھ ایسی غزلیں بھی آتی ہیں جہاں فیض اردو ادب کے جدید ادبی تقاضوں کی طرف سفر کرتے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کی غزلیں

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے
جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاکِ دامن کو تا جگر کر دے
میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

یا پھر

رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
فیضؔ تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

غزلِ فیض کے اس ابتدائی دور کے نصفِ آخر کو پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فیض کے شعری نقطۂ نظر میں ایک تبدیلی رونما ہوتی نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فیض "غمِ عشق" اور "غمِ روزگار" کی باہمی کشمکش اور حالتِ اضطراب سے گزرتے ہوئے اقبال اور غالب سے ذرا ہٹ کر میرؔ اور سوداؔ کی طرف اور پھر اپنے عہد سے قریب تر حسرت موہانی اور بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ عہد "غمِ عشق اور غمِ روزگار" کی کشمکش اور اُن کے ہاں "عہدِ ترکِ محبت" بھی کہلاتا ہے۔ یہاں غمِ روزگار کے حوالے سے ایک ہلکے سے درد کی کیفیت اور محبت میں ایک احساسِ شکستگی نظر آتا ہے۔ اور باطن میں پوشیدہ تہذیبی اور مذہبی اقدار سے دفائے عہد نہ کر سکنے کا احساس ہلکے ہلکے درد اور احساسِ تنہائی میں مبتلا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اسی دور کی ایک غزل نے دراصل فیض کو غزل گو شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں روشناس کروایا تھا۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دِن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اس غزل میں بہادر شاہ ظفرؔ کی مشہور غزل جس کے قافیے ماسوا ردیف کے فیضؔ کی غزل کے سے ہی ہیں جس میں زندگی کے چار دنوں کی تقسیم دو حصوں میں کی گئی نظر آتی ہے اور دونوں حصّے ہیں اور وہاں بھی ذکر غمِ عشق اور غمِ روزگار کا ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا یہ شعر ہے

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

فیضؔ کی غزل میں گو بختا دکھائی دیتا ہے۔ اِسی دور میں محبوب سے ترکِ محبت کا رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ ترکِ محبت روایتی اظہارِ محبت سے اجتناب کا رخ اختیار کرتا ہے۔ اِس نقطۂ نظر کی ابتدا تو دراصل غالبؔ سے ہو چکی تھی جب اُس نے کہا تھا کہ "عشق خلل ہے دماغ کا" لیکن دماغ کے خلل سے ذرا ہٹ کر حسرت موہانی کے ہاں غمِ روزگار کے تقاضوں کے تحت محبوب سے دوری کا احساس۔ لیکن اُس کی کشش کا ایک تسلسل قائم رکھنے کا ایک جذبہ کارفرما آتا ہے۔ حسرت موہانی کا شعر ہے اِس عہدِ ترکِ محبت میں بہت مقبول ہوا تھا

نہیں آتی جو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اس دور میں فیضؔ کے ہاں ترکِ محبت بھی ہے اور ایک کیفیت انتظار بھی ہے غمِ روزگار کے ساتھ احساسِ یار بھی ہے۔ اسی دور میں فیضؔ کے ہاں عقل و شعور اور خرد کے مشاہدے اور مجادلے بھی ہوتے ہیں جدلیاتی فلسفے سے روشناسی بھی ہوتی ہے اور اس

کے ساتھ انسان کے بنیادی جذبات۔ محبت نفرت، حیرت اور ضرورت اور ان سے وابستہ محرکات فیض کی قلبی واردات کو ایک نئی طاقت و توانائی اور حرکت و حرارت سے روشناس کرتے ہیں۔ یہاں سے فیض اردو ادب کی روایت کو لیکر تجدید کے دور میں داخل ہوتا ہے۔ اس دور کی نفسیاتی الجھن کو اپنی مخصوص تخلیقی صنعت اور ایجاد سے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے اور اس عہد کے شعور کو ایک نیا اوراک بخشتا ہے۔ اس دور کی چند غزلوں کے اشعار پیش کرنا ضروری ہیں۔

(۱)

وفائے وعدہ نہیں وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں
یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لئے آخر
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

(۲)

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دِل کو جلائیں ہم
خوش ہوں فراقِ قامتِ رخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانیٔ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
سلجھائیں بے دِلی سے یہ اُلجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختمِ عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

پھر ٹوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے
پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے
پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ، ہر اک راہ گزر سے
ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے
پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے وہ موج گزر جائے جو سر سے

"تجدید غزل" کے اِس دور میں فیض کے ہاں جو فکری تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں ایک طرف جدلیاتی فلسفے نے اور دوسری طرف وطن کی محبت نے خرد اور وجدان میں یکسوئی پیدا کی، محبت، محبوب کی یاد اور اس سے گہرے شعوری اور لاشعوری رستوں سے ہوتی ہوئی وطن سے وفاداری اور انسان دوستی کے جذبوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ محبوب کی یاد اور اُس کے پیار نے "دستِ صبا" کا روپ دھار لیا۔ جس میں نہ صرف محبوب کے ہاتھوں کی نرمی تھی بلکہ محبت کے لب و لہجے کی شیریں دہنی تھی۔ یہاں فیض کا لہجہ ایک طرف ترنم اور "شیریں دہنی" اور سوز و گداز سے بھرپور نظر آتا ہے۔ جب یہ نسوانی محبت کا ہندی رنگ فیض کی غزلوں کے رگ و ریشہ میں سمویا نظر آتا ہے۔ یہاں فیض نے اپنے لہجے کو رنگِ میر سے بہادر شاہ ظفر سے اور حسرت موہانی سے اپنی ادبی رفاقت کی بدولت ایک تاثیرِ دردِ انگیز سے روشناس کرایا۔ اور دوسری طرف جدلیاتی فلسفے کو ادبی تہذیب و تمدن کے حوالے سے اپنے اندر سمو کر ظلم و استبداد کے خلاف لوح و قلم سے جہاد کا آغاز کیا ظلم اور جور و ستم کے خلاف نفرت کا اظہار اپنے جذبۂ عشق کے تحت فارسی اور عربی ادب کی روایت کے حوالے سے ایک مخصوص "قوتِ مردانگی" "پیہم کشمکش" اور مسلسل جد و جہد کی شکل میں کیا اور مشکلات و مصائب کے دشت و بیاباں میں قیس، فرہاد اور منصور کے کرداروں کی بازگشت میں جدید انسانی تگ و دو کو پرانے استعاروں میں نئے روپ

سے روشناس کروایا۔

یہاں سے فیضؔ کی غزل غالبؔ اور اقبالؔ کے عہد سے رخصت ہوتی ہے اور یہیں سے فیضؔ کے کلام کی جادوگری کا عہد شروع ہوتا ہے۔ اور یہی فیض کا مقامِ غزل ہے۔ جس میں غزل کے ایک نئے مقام کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی ابتدا بھی فیض نے کی اور جسے انتہا تک بھی فیض ہی نے پہنچایا۔ اور جس کا آخری شاعر بھی فیض ہی نظر آتا ہے۔

فیض کی غزل کا تنقیدی جائزہ ابھی تک تو کسی تنقید نگار نے تسلی بخش صورت اور بھرپور شکل میں کیا نہیں۔ یہ کام کچھ مشکل بھی ہے۔ اور شاید اس میں کچھ وقت بھی لگے۔ لیکن فیض کی غزلوں کے قاری کی حیثیت سے اور شعر و سخن سے کچھ وابستگی رکھتے ہوئے جو چیز بہت تعجب خیز اور حیرت انگیز نظر آتی ہے اور جس سے فیض کی غزل کے جادو کا احساس بھی بہت واضح ہوتا ہے وہ ہے فیض کی غزلوں کے نفسِ مضمون کا ایک بہت ہی محدود کینوس اور مختصر سا فکری اور جذباتی حدود اربعہ یہاں فیض کی نظموں کی بات نہیں ہو رہی۔ فیض کی غزل کا محور "غمِ جاناں" اور "غمِ روزگار" کے درمیان ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد ہے "اس جدوجہد میں تلخیِ ایام" "اہلِ ستم کے جور و جفا" اور ان کے خلاف برسرِ پیکار رہنا، جبر و اختیار کے موسم کی تبدیلی "شبِ تاریک میں امیدِ سحر" "اغیار کے مقابلے میں عزت" یار کی یاد میں احساسِ فرقت تنہائی۔ اور اپنے شاعرانہ منصب کی حفاظت میں لوح و قلم کی پرورش۔ بس کچھ اسی قسم کے احساسات کے علاوہ آپ فیض کی غزلوں میں کچھ اور تلاش نہیں کر سکیں گے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فیض کی غزل اس کے تمام ہم عصروں کی غزلیہ شاعری سے نہ صرف الگ اور منفرد ہی کیوں ہے بلکہ اس کی تاثیر اتنی زود اثر اور ہمہ گیر کیوں ہے۔ اس کا مکمل جائزہ اس مضمون میں پیش کرنا مشکل ہے لیکن اس سمت میں فیض کی غزلوں کے نفسیاتی پہلوؤں کی طرف کچھ اشارے کر دینا لازم ہے۔

"دستِ صبا" کے مجموعے سے لے کر "غبارِ ایام" تک پچھلے تقریباً تیس سالوں میں فیض نے تقریباً اسّی کے قریب غزلیں لکھی ہیں۔ ان غزلوں کے پس منظر میں فیض کی سیاسی سرگزشت قید و بند کی صعوبتیں، وطن سے دوری کا دور، وطن کے اندر کے حادثات اور ان سے وابستہ رنج و الم اور احساسِ زیاں کو اگر آپ محض ادبی حوالے سے نظر انداز بھی کر دیں اور فیض کی ان غزلوں کو اردو ادب کے ایسے فرضی قاری کو پڑھوائیں جو اردو ادب کے تہذیب و تمدن سے خوب شناسا ہو اور وہ فیض کے ہم عصر شاعروں کی غزلیہ شاعری کو بھی پڑھے اور غالب کے بعد کے

دور کے غزل گو شاعروں کے کلام سے بھی روشناس ہو تو یہ فرضی قاری فیض کو اردو ادب کے نہ صرف کلاسیکی شاعروں میں شمار کرے گا بلکہ غالب کے بعد فیض کو جدید اردو ادب کا پیشرو قرار دے گا۔

اس کی ایک نفسیاتی توجیہہ ہو سکتی ہے۔ "فیض نے جدید دور کی دُکھتی رگ اور نبض پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔" یہ فقرہ قابلِ غور ہے۔ "دستِ صبا" سے لیکر بعد کی غزلیہ شاعری میں پانچ مخصوص نفسیاتی عنصر ہیں جن سے فیض اپنی غزلوں کی زبان استوار کرتا ہے۔ یونانیوں نے "ظروف سازی" POTTERY سے "شاعری" POETRY کے لفظ کو مستعار لیا، کیونکہ وہ حرفوں اور لفظوں کی ظروف سازی کو بھی ایک صنعت یا فن یا ایجاد قرار دیتے تھے۔ ان کے ہاں ضرورت سے زیادہ صنعت ایجاد اور دریافت کی ماں تھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اکثر اوقات صنعت یا ٹیکنالوجی سے ایجاد کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ضرورت ایجاد کی ماں بن جاتی ہے۔ فیض نے اپنے شعری اسلوب کی دریافت ایک حد تک اپنی صناعی سے کی ہے جو اُسے عربی۔ فارسی اور انگریزی ادب سے حاصل ہوتی۔ اور دوسری طرف جذبۂ ضرورت کے بے اختیار اظہار نے اُسے اپنا مخصوص شعری قالب ڈھالنے میں مدد دی۔ اس کی غزلوں میں صنعت و حرفت بھی ہے۔ جیسے وہ خود بھی بڑھئی کے کام سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اور ان کا ہاتھ نبض شناس بھی ہے جو جدید دور کے اجتماعی وجود کی نبض پر رکھا ہوا ہے۔ فیض کی غزلیہ شاعری کے پانچ مخصوص نفسیاتی رجحان اور ادبی پیکر اور ان کے اندر مضمر شعور و حواس اور جذبات کی آمیزش کے مخصوص رنگ ہیں۔ (۱) فیض کا احساسِ تنہائی اور اُس کے اندر مسلسل انتظار کی ایک کیفیت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص احساسِ خلوت کا خمار بھی ہے۔ فیض کے ہاں تنہائی LONLINESS بھی ہے اور خمارِ خلوت بھی SOLITUDE. فیض کی تمام غزلوں میں یہ تاثر کسی نہ کسی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ احساسِ تنہائی اور خمارِ خلوت جدید دور پر گراں بھی ہے اور اس کے لیے ایک حد تک سکون و طرب کا باعث بھی اور وجہ حسرت و استعجاب بھی۔ جذبۂ حیرت اسے تنہائی اور خلوت کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔ فیض کے اس نفسیاتی پہلو کی طرف یوں تو ساری غزلوں کا میلان ہے لیکن مضمون کی طوالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے چند شعر ہی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمُ شدہ آواز

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دِن بہار کے

کئی بار اُس کا دامن بھر دیا حسنِ دوعالم سے
مگر دِل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
کئی بار اُس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دِلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

کب ٹھہرے گا دردِ اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی
کب جان لہو ہوگی کب اشک گوہر ہوگا
کس دِن تیری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

آخرِ شب کے ہمسفر فیضؔ نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

بیتا دیا امید کا موسم خاک اڑتی ہے آنکھوں پر
کب بھیجو گے درد کا بادل کب برکھا برساؤ گے

اِس وقت تو یوں لگتا ہے کہ اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اِک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

(ii) دوسری خصوصیت فیض کا موسم انتظار ہے جو ایک لمبے دشتِ طلب کی سیاحی کا بھی دوسرا نام ہے۔ جہاں خزاں کے دور بھی ہیں اور بہاروں کی امیدیں بھی۔ جہاں دستِ صبا کے ہاتھوں کی نرمیاں بھی ہیں اور جور و ستم کی گرمیاں اور سختیاں بھی۔ یہ موسم انتظار کبھی قید و قفس میں اور کبھی جلاوطنی اور غریب الوطنی کے لمبے ادوار سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اِس موسم انتظار کا رجائی پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔ یوں تو فیض کی اکثر غزلوں میں کیفیت انتظار شدت سے موجزن رہتی ہے اور بظاہر اُس کے نمونے پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں لیکن غزل کے اِس نفسیاتی مطالعہ میں کچھ اشعار کا ذکر کر دینا مناسب ہو گا ؎

روِش روِش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے
دشتِ امید میں گرداں ہیں دوانے کب سے

میری جاں آج کا غم نہ کر نجانے کاتبِ وقت نے
اپنے کل میں بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبو کی قبا آخرِ شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا یہاں اول صبح
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

(۱۱) تیسری خصوصیت فیض کی غزلوں کا ایک مخصوص نظامِ حرکت ہے۔ جو ہر وقت رواں دواں رہنے کی کیفیت سے روشناس کرتا ہے۔ چاہے وہ ماضی کا استمرار ہو یا حال کی کیفیت گزراں یا مستقبل کی آمد۔ اس کی غزلوں میں ایک مسلسل حرکت، رواں دواں رہتی ہے۔ اُس کی تشبیہیں اور استعارے بنیادی طور پر حرکی ہیں۔ ایک مسلسل لرزش، تحریک، اور موومنٹ (MOVEMENT) کا احساس اس کی غزلوں میں بہت ہی نمایاں ہے۔ یہ گردش اور حرکت اُس کے "لفظی نادرِ" سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے تخیل اور جذبے کی مسلسل سرگردانی سے بھی۔ وہ غزلوں میں خیالوں اور جذبوں کے آنے جانے کی رفتار کو بھی تیز رکھتا ہے۔ اور حروف و الفاظ کے تکرار اور ان کی استمراری کیفیت سے بھی یہ کام لیتا ہے۔
اس سلسلے میں چند اشعار پیش ہیں ؎

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

تم آتے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے
ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

فکرِ دلداریِ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں
یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں
قصہ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں

دل میں یوں اب ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں
رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں
اور کچھ دیر نہ گزرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

شامِ فراق، اب نہ پوچھو آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
آخرِ شب کے ہمسفر فیض نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا۔ صبح کدھر نکل گئی

تیرے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سرِ رہگزار چلے گئے
تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
میرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پہ سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

کس حرفِ پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا
سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دِل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ فیض کے ہاں بصری تشبیہیں، تلمیحیں اور استعارے بہت حد تک کم ہیں۔ اُس کے ہاں صوت وصدا اور حسی و لمسی استعاروں اور ان سے وابستہ حروف و الفاظ کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ اس کی غزلوں میں صوتی اور ترنمی نظام انسانی وجود میں نہ صرف لرزش پیدا کرتا ہے بلکہ ایک احساسِ نغمگی اور لمسی ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ کبھی یہ لفظوں کی تکرار سے اور کبھی یوں لگتا ہے کہ تمام حواسِ خمسہ جسم کو چھو رہے ہیں۔ فیض کی اس صنعتِ حروف گری اور لفظوں کی ظروف سازی سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ لفظوں کے ظروف میں آبِ حیات ڈال کر اپنی غزلوں سے جل ترنگ کے نغمے چھیڑتا ہے۔ اور وہ بدن کو چھوتے ہیں۔ فیض کے ہاں یہ چھونے کا عنصر اس کی غزلوں میں بہت نمایاں ہے۔ چاہے یہ چھونے کا احساس دستِ صبا کی صورت

میں ہو یا دستِ خزاں یا دستِ تہہ سنگ کی صورت میں ہو یا یہ زنداں پہ دستک ہو دستِ عدو ہو یا دستِ دعا سرِ وادیٔ سینا یا شامِ شہرِ یاراں صوت و صدا کے لمس اور چھونے کی کیفیت سرسراتی ہے۔ اس طرح کے کچھ حسی تشبیہات اور استعاروں کے لیے اشعار دیکھئے۔ جن میں قوتِ لامسہ اشاروں کے ساتھ ساتھ صوت و صدا اور ایک حرکی نظام کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے ہوتا ہے آج یہ دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
کوئی پکار کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

پھر دیکھیے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیاہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سینے پہ لگی ہے

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے
ہمیں نے روک لیا پنجۂ جنوں ورنہ
ہمیں اسیر یہ کوتاہ کمند کیا کرتے
گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں
بادِ خزاں کا شکر کرو فیضؔ جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون
پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانیے پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون

---

(۷) یہ مسلسل سفر ماضی، حال اور مستقبل میں نہ صرف رواں دواں رہتا ہے بلکہ اس کے ہاں مخصوص حرکی نظام کے تحت ماضی، حال اور مستقبل انسانی وجود کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ فیضؔ کے مناظر بصری مناظر کم ہوتے ہیں۔ وہ صوت و صدا سے بُنے ہوئے نغموں کی صورت میں ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ حرکت اپنے محور کے ارد گرد

رہنے کے باوجود ایک زینۂ پیچاں کی صورت ماضی سے حال کی طرف اور حال سے مستقبل کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ فیض کی غزلیں جرسِ کارواں اور حدی خواں کے نغموں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ایک ایسا کاروانِ حیات جو دشتِ طلب سے گزر رہا ہے اور مستقبل کے گلشن و گلزار کی اُمید اور تمنا اپنے تمام نشاط و غم کے ساتھ چلتے جانے کی تحریک کرتی رہتی ہے۔ شکوہ اور شکایت، غم و غصہ اگر اظہار بھی پاتے ہیں تو ایسے دھیمے لہجے ہیں کہ ان کا احساس فیض کے صبر و تحمل کی فضا کو مرتعش نہیں کرتا۔ فیض کا یہ فن صبر و استقلال اس کی غزلوں میں اُمید و آرزو کو کبھی سحر کے روپ میں کبھی موسم نو بہار کے رنگ میں اور کبھی شام شہر یاراں کی رونق میں ڈھالتا رہتا ہے۔

مندرجہ بالا پانچ خصوصیات کو یعنی فیض کے احساسِ تنہائی اور خمارِ خلوت کیفیتِ انتظار صورت و صدا کا حسی اور لمسی نظام، مسلسل حرکت کی کیفیت اور امید و رجا کا پہلو اس کی غزلوں کو جدید دور میں ایک ایسا غنائی تاثر بخشتا ہے۔ جو کسی اور غزل گو میں نظر نہیں آتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ فیض نے اپنے ہم عصر موسیقاروں سے ہمارے نظام موسیقی کا نہ صرف بغور مطالعہ ہی کیا بلکہ اس کا تجربہ بھی دار و واتی انداز سے محسوس کیا اس دور میں فیض کی جو مشہور غزلیں ہیں مثلاً ؎

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
"ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے"
"صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک"
"سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے"
"رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام"
"موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام"

اور پھر اس قسم کی غزلیں ؎

وہیں ہیں دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہی خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یا پھر زنداں نامہ کی مشہور غزل ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے
بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام سے آئیں گے غمگسار چلے
جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے
مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یہ تمام غزلیں مضمون کی طوالت کے باعث یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔ اُردو ادب کے اکثر قاری اِن غزلوں کو دلوں میں بسائے ہوئے ہیں۔ اُردو ادب میں بہت کم غزل گو شاعر ہیں جن کی غزلوں کو اِس قدر یاد رکھا گیا ہو۔ اور وہ اس قدر زبانِ زدِ عام ہوں پوری غزل کا دِل میں راہ پا جانا اردو ادب میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ کچھ میر کے ہاں۔ اکثر غالب کی غزلوں میں اور غالب کے بعد دو چار غزلیں بہادر شاہ ظفر کی پھر بعد میں دو تین غزلیں علامہ اقبال کی۔ اس کے بعد یہ اعزاز فیض کو ہی حاصل ہوتا ہے کہ اس کی تقریباً ایک درجن غزلیں ایسی ضرور ہیں جو لوگوں کی فضائے یاد میں ہمیشہ تازہ رہتی ہیں۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ تو یہی دُکھ آمیز لیکن طرب ناک نغمگی اور موسیقی ہے اور فیض کے لفظوں کی صوت و صدا کا جادو ہے جو دشتِ تنہائی میں کبھی جرس کارواں بن کر اور کبھی کاروانِ حیات کے حُدی خواں کی صورت میں نغمہ سرا ہوتا ہے جو انسان کو اس دور کی شبِ تیرہ و تار میں ظلم و

ظلمت کے کمین گاہوں سے اغیار کی یلغاروں کے باوجود صبر و سکون کے ساتھ مسلسل تگ و دو کے اِس سفر پر گامزن رہنے کی تلقین اور حوصلہ دیتا ہے۔ صبا بار بار آ کے دستک دیتی رہتی ہے کہ سحر قریب ہے دِل سے کہو نہ گھبرائے۔ فیض نہ تو انقلاب کا نقیب ہے اور نہ ہی ڈھنڈورچی اور نہ ہی خطیب۔ وہ تو حدی خوان ہے اور خود کہتا ہے۔

شاید اپنا بھی کوئی بیت حدی خواں بن کر
ساتھ جائے گا، مرے یار جدھر جائیں گے
فیض آتے ہیں رہِ عشق میں وہ سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے
نعمت زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے
لاکھ گھبرا کے یہ کہتے رہیں مر جائیں گے

"آنے والوں کو کہو ہم تو گزر جائیں گے۔" فیض کی تمام غزلیہ شاعری میں اور نظموں میں اکثر "ہم" کی ضمیر کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو فیض کا اجتماعی شعور ہے جو جدلیاتی فلسفے کی تہذیب سے آیا ہے اور دوسری وجہ فیض کا عربی شاعری پر عبور ہے۔ عرب کی قدیم اور جدید شاعری دونوں میں شاعر قبیلے اور گروہ کے اجتماعی شعور کا علم بردار ہوتا ہے اور عربی شاعری میں "سبع معلقہ" سے لیکر آج تک شاعر قوم کی آواز کو "ہم" کی ضمیر سے ہی ادا کرتا ہے۔ اور پھر اس میں ایک اندازِ خسروانہ بھی ہے جو فیض کی اپنی شخصیت میں اپنی نرمی اور سادگی کے باوجود موجود تھا اس کا انداز فقیرانہ بھی تھا اور خسروانہ بھی۔

غزلِ فیض کے تیسرے دور کے آخری حصے میں فیض کی غزلوں کا آہنگ اور لب و لہجہ میر تقی میر سے بہت حد تک ہم کلام نظر آتا ہے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ "میر وادیِ سینا" کی شروعات میر کے اس شعر سے کی گئی ہیں۔

"موسم آیا تو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا"

مثلاً فیض کی غزلوں کے یہ چند اشعار رنگ میر کی غمازی کرتے ہیں ؎

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دِل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا
جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگِ گلِ طناز کیا
لو وصل کی ساعت آپہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا

اسی طرح ایک اور غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے
دشتِ امید میں گرداں ہیں دوانے کب سے
دیر سے آنکھ پہ اترا نہیں اشکوں کا عذاب
اپنے ذمے ہے ترا قرض نہ جانے کب سے
کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب
درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے
فیض پھر کب کسی مقتل میں کریں گے آباد
لب پہ ویراں ہیں شہیدوں کے فسانے کب سے

یا پھر اس قسم کے شعر۔

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا
غمِ جہاں ہو رخِ یار ہو بادستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

دیکھو تو کدھر آج رخِ بادِ صبا ہے
کس راہ سے پیام آیا ہے زندانیِ دل کا
اترے تھے وہ فیض کبھی آئینۂ دل میں
ہے آج بھی عالم وہی حیرانیِ دل کا

تھی یاروں کی بہتات تو ہم اغیار سے بھی بیزار نہ تھے
جب مل بیٹھے تو دشمن کا بھی ساتھ گوارا گزرا تھا
اب تو ہاتھ سوجھائی نہ دیوے لیکن اب سے پہلے تو
آنکھ اٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا گزرا تھا

کبھی کچھ سے تیرا دیا ہوا کبھی راحتیں کبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کئے یہ ہیں ورق سب تیری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا، کئی شامِ ہجر کی مدتیں
میری جان آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے جو صید تھے اب صیاد ہوئے
پہلے بھی خزاں میں باغ اجڑے پر یوں نہیں جیسے کہ اب کے برس
سارے بوٹے پتا پتا روش روش برباد ہوئے
پہلے بھی طوافِ شمعِ وفا تھی رسم محبت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصور ہوئے فرہاد ہوئے
فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہنے یا مصر میں جا آباد ہوئے

گو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا ایسے نہیں ہوتا
ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

میر صفت غزل کی مثال فیض کی ایک دکنی غزل میں بھی ملتی ہے۔ جہاں لہجہ تو دکنی ہے لیکن آہنگ میں فیض میر ہے۔ ؎

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارہ گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا
تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فرصت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا
اب کے تو خزاں ایسی ٹھہری وہ سارے زمانے بھول گئے
جب موسمِ گل ہر پھیرے میں آ آ کے دوبارہ گزرے تھا

فیض کے اس دور میں کچھ ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں فیض نے میر کی ہمسری کے ساتھ اپنے کچھ ہم عصر شاعروں کی طرف بھی التفات کیا۔ فیض کی چند ایسی غزلوں کے مختصر سے نمونے پیشِ خدمت ہیں ؎

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخرِ شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب
لمسِ جانانہ لئے مستیٔ پیمانہ لیے
حمدِ باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اول صبح
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا
تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ سویرا نہ اندھیرا
آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
اک بَیر نہ اک مہر نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا

جیسے ہم بزم ہیں پھر یار طرحدار سے ہم
رات ملتے رہے اپنے در و دیوار سے ہم
ہم سے بے بہرہ ہوئی اب جرس گل کی صدا
ورنہ واقف تھے ہر اک رنگ کی جھنکار سے ہم

کب تک دل کی خیر منائیں کب تک راہ دکھاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے
بیتا دید امید کا موسم خاک اڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل کب برکھا برساؤ گے
عہد وفا یا ترک محبت جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے ان کو کیا جتلاؤ گے
فیض دلوں کے بھاگ میں ہے گھر بھرنا بھی لٹ جانا بھی
تم اس حسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اتراؤ گے

آخر میں فیض کے چند ایک اہم ہم عصر غزل گو شاعروں کا ذکر کرنا بھی ضروری سا لگتا ہے۔ کیونکہ فیض کے مقام غزل کے اردگرد کا پس منظر ان کے ہم عصر شاعروں کے ذکر کے بغیر شاید پوری طرح اجاگر نہ ہو سکے۔ فیض کی ہم عصری کا دور ایک بہت لمبا دور ہے جو دراصل اقبال اور حسرت موہانی سے شروع ہو کر فانی جگر یاس یگانہ، اصغر گونڈوی، فراق گورکھپوری، مجاز۔ جذبی۔ مجروح سلطانپوری، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری ناصر کاظمی، احمد فراز شہزاد احمد، سلیم احمد۔ احمد مشتاق، ظفر اقبال، اور منیر نیازی کے علاوہ بہت سے جدید غزل گو شعراء تک جا پہنچتا ہے۔ لیکن یہاں سب کا ذکر ———— تفصیلاً مشکل ہے اور ضروری بھی نہیں۔ صرف ان ہی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو فیض کے پس منظر میں آتے ہیں۔ یاس یگانہ کی شاعری کو تو غالب کی غزل کا ردعمل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جگر داغ کی شاعری کا پرتو ہی بنتے ہیں۔ گو لہجے میں کچھ ذوق فقیری بھی ہے اور اثر میری بھی۔ فانی۔ جذبی اور اصغر گونڈوی غالب اور اقبال کے فلسفیانہ رنگ میں اپنے اپنے لہجے میں غزل گوئی کرتے نظر آتے ہیں۔ مجاز کے ہاں جدیدیت کی چنگاری پھوٹتی ہے اور کچھ ترقی پسند اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں لیکن ان کی نوائیں نہ شعلہ بن سکی نہ شبنم۔ گو فیض ان کے مداح نظر آتے ہیں۔ غزل کے اس جدید دور میں فیض کے آس پاس تین غزل گو اپنے اپنے لہجے اور آہنگ کے اعتبار سے اہم قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ فراق۔ حفیظ ہوشیارپوری اور ناصر کاظمی۔ فراق کا شعری کینوس بہت وسیع ہے اس کے ہاں غزل کے خارجی اور باطنی دونوں روپ اور بہروپ ہیں۔ اس کی غزل کے استعارے۔ تشبیہیں اور بندشیں اور مضمون کے موضوعات کا کوئی حد و شمار نہیں۔ لیکن فراق کا مسئلہ دراصل ان کی غزلیہ شاعری کا بے محور ہونا ہے۔ وہ سطروں کی شیشہ گری اور آئینہ سازی خوب جانتے ہیں اور ان کے ہاں شاعری کی جبلی "صنعت" کا بھی بہت زور ہے۔ لیکن شاعری کے لئے جن جذباتی، لاشعوری اور واردتی چشموں کی ضرورت ہوتی ہے اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں شعروں کے جگنو تو مت نظر آئیں گے

لیکن ان کی غزلوں میں اگر آپ مقاماتِ حیرت و محبت، بالنفرت و ضرورت تلاش کریں تو ان کا مجموعی تاثر آپ کو ان کی پوری غزلوں میں فضا پیدا کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ شاید کچھ طبائع پہ یہ گراں گزرے کہ فراق کی غزلوں کا مجموعی تاثر جوش کی نظموں جیسا ہے۔ وہ غزل کے جوش دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں الفاظ و خیالات، تشبیہات اور استعارات بے شمار ہیں اور اس زبان کے تلاطم میں اچھے شعر بھی کہیں ڈوبتے کہیں تیرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن غزل اپنا پورا پیکر تلاش نہیں کر پاتی جیسے جوش کی نظموں میں لفظوں کے توپ و تفنگ ہیں اسی طرح فراق کی غزلوں میں حرف و صنعت کے بے شمار اچھے نمونے ہیں۔ لیکن ان کی غزل نہ تو ان کے خارج کا مظہر قرار پائی ہے اور نہ ہی ان کے باطن کا اظہار۔ ان کی غزلوں کا شعری وجود بکھرا بکھرا سا نظر آتا ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری صنعتِ غزل کے مشاق شاعر ہیں ان کا اپنا ایک لہجہ بھی ہے اور ایک آہنگ بھی لیکن ان کا لہجہ اتنا زیرِ لب ہے کہ ان کے شعروں کی گنگناہٹ تو متاثر کرتی ہے لیکن ان کے دل کی واردات کو نہ تو ندا بخشتی ہے اور نہ ہی نوا۔ اردو غزل کے طالب علم کے لئے فراق گھور کھپوری اور حفیظ ہوشیار پوری کے پاس بہت کچھ ہے لیکن اردو ادب کے قاری کو چاہیے وہ عوام ہوں یا خواص ان سے دیر پا وابستگی رکھنا مشکل نظر آتا ہے۔

جدید غزل میں ناصر کاظمی کا اپنا مخصوص شعری کینوس بھی فیض کی طرح گو محدود ہے۔ لیکن اس کی شاعری کا بھی اپنا ایک محور ہے۔ جس کے اردگرد اس کا شعری وجدان گھومتا ہے۔ ناصر کاظمی کی غزلیں بھی فیض کی ہم عصری کے دور میں برصغیر ہند و پاک میں آہستہ آہستہ پچھلے بیس تیس سالوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ اور اس کا طرزِ سخن خواص کے دائرے سے نکل کر مقبولیت عام کے دور میں داخل ہو رہا ہے کسی حد تک ناصر کی شاعری فیض کی غزلیہ شاعری کی ضد نظر آتی ہے۔ فیض کے ہاں محبت، نفرت اور ضرورت کے سرچشمے جبر و استبداد کی وادیوں میں کبھی قیس کبھی فرہاد کی صورت میں اور کبھی منصور کی سرمستی میں ظہور پذیر ہو کر کوئے یار سے نکل کر دشتِ طلب میں نورِ سحر کی تلاش میں سوئے دار جاتے نظر آتے ہیں۔ یہ باطن سے ظاہر کا سفر اور ظاہر سے باطن کی طرف واپسی ان کو کبھی مقامِ حیرت سے روشناس کرتی ہے اور کبھی مقاماتِ خلوت و تنہائی سے لیکن اس مسلسل سفر کی سرگردانی میں ان کی غزل غمِ عشق اور غمِ روزگار غمِ ہستی اور غمِ زمانہ سے دست و گریباں ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک طرب ناک تمازت کا بھرپور احساس رکھتی ہے۔ دوسری طرف

ناصر کے ہاں ایک سپردگی، فراغت اور سکون کا احساس ان کی شاعری کی شب ہجور میں رنج والم کے باوجود موجود رہتا ہے۔ اس میں آفتاب کی گرمی بھی شاید کہیں کہیں آپ ڈھونڈ سکیں۔ لیکن شب مہتاب کی ٹھنڈک اور نرمی ہر دم نمایاں ہے۔ ناصر کاظمی کی غزلوں کا بھی اپنا ایک مقام حیرت وتنہائی ہے۔ اس کے ہاں بھی ترکِ محبت کا دور ہے۔ وہاں صبا بار بار آکے اپنے ہاتھوں کی ٹھنڈک سے اطمینان تو نہیں بخشتی لیکن اُس کی غزلوں کا چاند بھی شہر کی اداسیوں اور ویرانیوں پر گاہے گاہے اترتا رہتا ہے۔ وہاں بھی موسم کبھی خزاں کے ہیں اور کبھی بہار کے، کبھی امید کے اور کبھی یاس کے لیکن اس کی غزلوں کی شب گزیدگی اور شب گردانی میں بھی انسانی افق امید پر سورج طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔ جدید دور میں جس طرح غالب کے بعد فیض ہی بڑا غزل گو شاعر نظر آتا ہے۔ اسی طرح اپنے رنگ میں میرؔ کے بعد ناصر کاظمی ہی میرؔ کا پرچم اٹھائے نظر آتا ہے۔ باقی رہا بقائے دوام کا مسئلہ تو۔

"محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے"

ستار طاہر
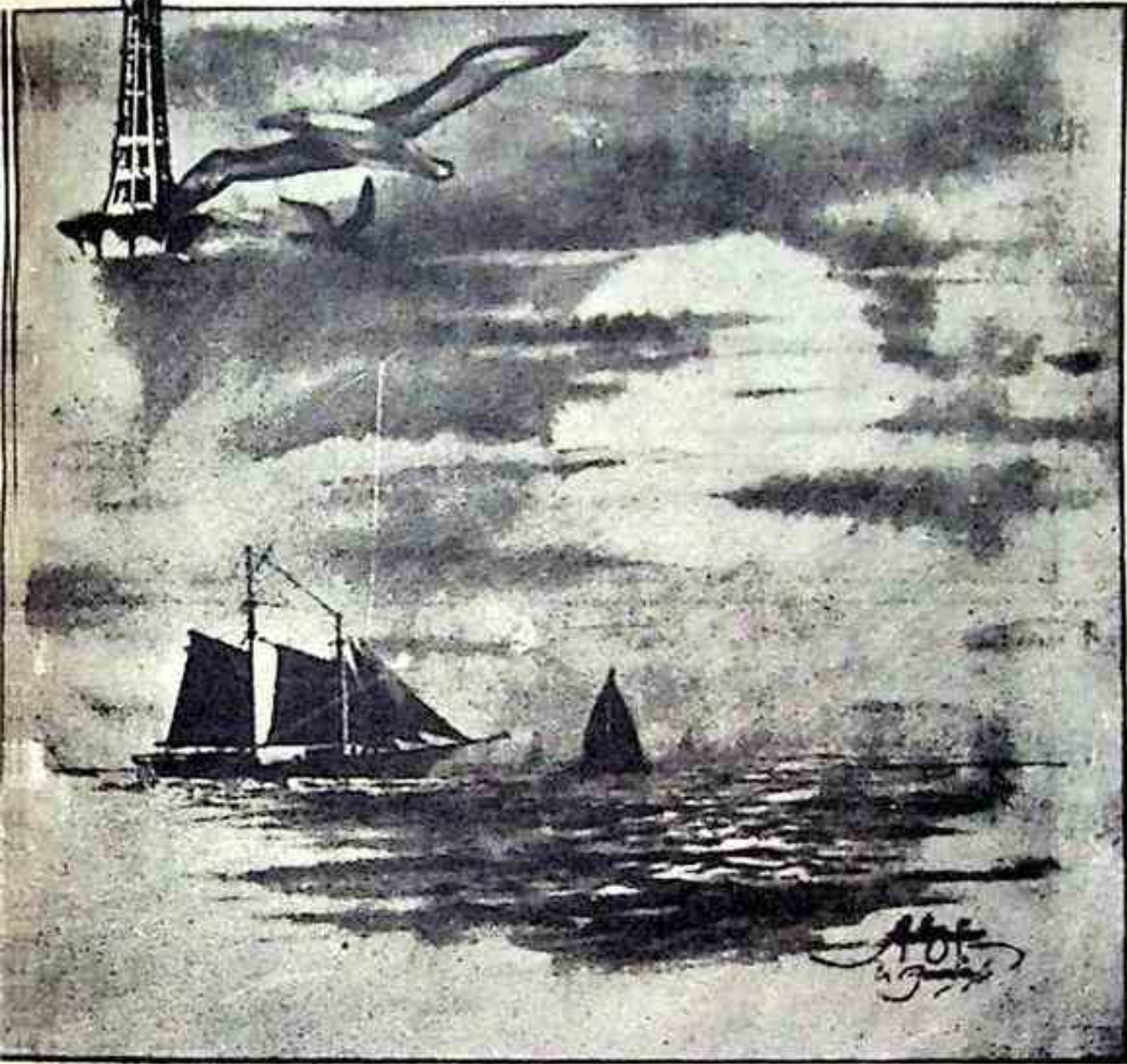
فیض صاحب کی ایک نظم

تنہائی آج کے انسان کا مقدر ہے اور انسان کی تنہائی ایک موضوع ہے۔ جو سدا بہار رہا ہے۔ دنیا کی کسی زبان کی شاعری اور فکشن کو پڑھ لیجیے۔ وہاں اس موضوع پر لکھی ہوئی تخلیقات کی فراوانی نظر آئے گی۔ لیکن جس قسم کی خاص تنہائی کا ذائقہ انسان نے بیسویں صدی میں چکھا۔ یہ ذائقہ ہی کچھ اور ہے اس تنہائی نے انسان کی بے چارگی اور بے بسی اور ہجوم میں شامل ہونے کے باوجود محسوس ہونے والی کیفیت کو زبان اور معنویت سے آشکار کیا ہے؛

کتاب پیدائش میں لکھا ہے کہ آدمی کے لیے تنہا رہنا اچھا نہیں۔ گویا انسان کو کسی طرح سے تنہائی سے بچنا چاہیئے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ انسان سدا سے تنہائی کا شکار رہا اور بیسویں صدی میں تو اس کو جس تنہائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا تصور اس سے پہلے کی صدیوں میں کم ہی کیا جا سکتا ہے۔

کتاب پیدائش میں تو کہا گیا کہ تنہائی آدمی کے لیے اچھی نہیں اس لیے اس سے بچو۔ لیکن بیسویں صدی کا انسان اس تنہائی میں ہی مبتلا ہوا جب خدا نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ ڈلن تھامس کی ایک نظم میں شاعر خدا سے فریاد کرتا نظر آتا ہے کہ اے خدا جب تم نے مجھے چھوڑ جانا تھا تنہا کر دینا تھا تو پھر مجھے پیدا ہی کیوں کیا؟

جوش بلنگز (وفات ۱۸۸۵) بھی لکھتا تھا۔

تنہائی ایسا مقام ہے۔ جسے دیکھنا تو اچھا ہے۔ لیکن رہائش کیلئے ناموزوں ہے۔

اور پھر یہ بھی تو تنہائی زدہ زندگی کی یکسانیت کی تھکن تھی۔ جس نے پال والری سے

کھلوایا ۔

ITS TRUE I AM GLOOMY, AND MISERABLY
TIRED OF MYSELF AND MY LONLINESS
AND OF THESE GLOMY DAWNS
IN WHICH THE SOUL SMOKES
I FEEL THE FATIGUE OF AN ANGEL WEIGHING ON ME

بیسویں صدی میں پہلا مژدہ تو نطشے نے سنایا کہ خدا مر چکا ہے۔ یوں انسان اس کائنات میں خدا سے محروم ہو گیا۔ اور پھر وہ لمحہ آیا۔ جب کولن ولسن نے انسان کی موت کی نوید دی۔ اس کے بعد وجودی فلسفیوں، شاعروں اور ناول نگاروں نے جہاں تنہائی کے اعماق کی نشاندہی کی۔ وہاں اس کی ہونناکیوں کو ہی فرد پر مسلط کر دیا۔

تنہائی کا تجربہ طرح طرح سے فنکاروں کی تخلیقات کا حصہ بنا۔ ژیٹس نے صنعتی شہروں سے بھاگ جانا چاہا اور کیونکہ اجتماعی صنعتی دنیا میں وہ خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے اسی تنہائی کا مزہ چکھنے کی خواہش کا اظہار ایک نظم میں کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ وہ شہروں سے دور کسی ویرانے میں جھونپڑا بنا لے گا۔ شہد کی مکھیاں اس کی رفیق ہوں گی۔ اس نظم میں ژیٹس نے انسان سے انسان کی تنہائی کے روگ کو ختم کرنے کے لیے ویرانے اور شہد کی مکھیوں کی رفاقت میں اس تنہائی کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

بریخت جیسے انقلابی اور عہد ساز ڈرامہ نگار اور شاعر کا تجربہ مختلف تھا۔ اس نے تنہائی کو انسانی زندگی کی بے معنویت کا اور بے مقصدیت کا سرچشمہ قرار دیا۔ بریخت کی ایک نظم کا [illegible] ٹکڑا ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے۔

جوانی میں اداسی و ملال
اور اس کے بعد بھی ملال دائمی
میں تنہا ......
کب میں مسرور ہوں گا۔

زمانے کو بدلا جاتا ہے

زمانہ بدل جائے وقت کا ... تبدیل ہو تو شاید تنہائی بھی دور ہو۔ مگر بعد میں دوسری نظم میں پہیہ تبدیل ہو رہا ہے لیکن تنہائی کا دائمی روگ — جان کو چمٹا ہے۔ بریکیت کہتا ہے۔

IS IT BY THE SIDE OF THE ROAD
(ALONE ALWAYS ALONE)
THE DRIVER CHANGES THE WHEEL
　　　I DONT LIKE WHERE I HAVE COME FROM
I DONT LIKE WHERE I AM GOING
WHY THEN DO I CAHNGE THE WHEELCHANGE
　　　　　　WITH IMPATIENCES
ALONEALWAYS ALONE

تنہائی - جو بے چینی محسوس کی جاتی ہے۔ اس میں بے چینی کا عنصر جس کرب سے آشنا کرتا ہے۔ اس کا اظہار - فیض صاحب کی لافانی نظم "تنہائی" میں ہوا ہے"
دنیا کی دوسری زبانوں اور شاعروں کو چھوڑیئے ..... خود اردو شاعری میں تنہائی اور انتظار کے حوالے سے ایسا ایسا بے مثل شعر کہا گیا اور نظمیں لکھی گئی ہیں کہ جن پر اردو شاعری فخر کر سکتی ہے۔ لیکن اس موضوع پر فیض صاحب کی نظم سب سے الگ تھلگ اور سربلند، ممتاز اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔
"تنہائی" کے کرب، اس کی اندر بے چینی، موہوم امید اور بے قراری کو۔ کس انداز سے فیض صاحب نے بیان کیا ہے۔
فیض صاحب کی پوری نظم مندرج ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

(نقشِ فریادی)

تنہائی، فیض صاحب کے اولیں مجموعے "نقش فریادی" میں شامل ہے۔ یہ نظم فیض صاحب کی شاعری کے مجموعی مزاج سے بھی الگ تھلگ دکھائی دیتی ہے۔ فیض صاحب کے رومانویت کا غلبہ ان کے ابتدائی مجموعے کی نظموں میں بہت شدید دکھائی دیتا ہے۔ یہ رومانویت ان کے ہاں آخر دم تک رہی اگرچہ موضوعات کا تنوع، زندگی کی جدوجہد سنہرے مستقبل کی نوید، زندگی کے حقائق کی تلخیاں اور صداقتیں، فطرت کا حسن، اور کا جمال بعد میں ان کے ہاں حاوی ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسانیت کا دکھ اور انسان کا مستقبل اور اس کے حوالے سے انقلاب بہتر دنوں کی نوید، فرد کی جدوجہد میں مردانگی قیدو بند کی صعوبتوں اور جیلوں کی سلاخوں کے سے نظر آنے والا چاند، محبت کی وارفتگی ..... ظلم و استبداد کی مذمت۔ اور کارزارِ حیات میں کھرا فیض کا آئیڈیل انسان۔ جو ہر صعوبت کو خندہ پیشانی سے ایک صوفی کی طرح برداشت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اتنی تنہائی - ایسی مایوسی - جو اس نظم میں متشکل ہوتی ہے۔ فیض صاحب کے پورے کلام میں نہیں ملتی۔

اس نظم میں فیض صاحب نے اس تنہائی کو موضوع بنایا۔ جو بیسویں صدی کے انسان کو چاٹ رہی ہے۔ فیض صاحب کے ہاں جو رجائیت ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا غیر ضروری ہوگا۔ مگر یہ نظم ایسی ہے۔ جس میں رجائیت دم توڑ جاتی ہے۔ امید کے سب چراغ گل کر دیے جاتے ہیں۔

انسان کی تنہائی پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں یہ نظم بہت فن پارے کی حیثیت رکھتی ہے۔

غالب کا ایک شعر ہے ؎

ٹھہرنے دے مجھے اے نومیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے....

مایوسی اور بے چارگی کے بھنور میں پھنسا فرد آخری لمحے میں بھی استقامت کا اظہار کرتا ہے۔ چھوٹتے ہوئے دامانِ خیالِ یار کو تھامنے کے لیے اپنے آپ کو للکارتا ہے .... لیکن تنہائی کا آخری مصرعہ دیکھئے..... اس میں تنہائی کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے

ملٹن کی ایک لائن ہے۔

WE WILLIONS MORTAL LIVE ALONE

یہ مصرعہ ابدی اور لازوال صداقت کا حامل ہے۔ یہ انسان کی تنہائی کا ترجمان ہے فیض صاحب کی نظم بھی تنہائی کی بھرپور اور مکمل ترجمانی کرتی ہے.... یہ وہ تنہائی ہے ... جس کا بیان آندرے ماروانے یوں کیا ہے۔

MEN FEAR SICENCE AS TUEY FEAR
SOLI TUDE BECAUSE BOTH GIUE
THEM A GLIWPSE OF THE TERROR
OF LIFE A NOTHINGNESS

تنہائی کا ایک ایک مصرعہ دیکھئے۔ کس شدت کی جانکنی اور مایوسی کا اظہار ہے تنہائی اردو کی حدود سے چند نظموں میں سے ایک ہے۔ جس کا ہر COMA اور SIGHN OF EXCLAMATION تک اپنے اندر معنویت کا جہان چھپائے ہوئے ہے۔ اس نظم کا جو پیکر بنتا ہے۔ جو تصویر ذہن میں بنتی ہے۔ تشبیہات، محرکات اور علامتوں نے اسے ایک بھرپور تصویر بنا دیا ہے۔ اردو کی بہت کم نظمیں ایسی ہیں۔ جن کی ایسی موثر اور جاندار تصویر بن سکتی ہو۔

اس نظم میں ڈھلتی رات کا منظر ہے۔ جب تاروں کا غبار بکھرنے لگا ہے۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے ہیں۔ "راستہ تک تک کے سو جانے والی ہر اک رہگذر کے حوالے سے زبان پر فیض صاحب کی دسترس اپنے عروج پر ملتی ہے۔ ویرانی کا منظر یوں مکمل ہوتا ہے کہ قدموں کے سراغ تک دھندلا چکے ہیں۔ اور پھر تنہائی کے حوالے سے جنم لینے والی مایوسی اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔

گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو....
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا....

سموئل بیکٹ کے
آبھی نہیں چکتا۔ انتظار مایوسی کے اس انتہائی مرحلے کو چھو لیتا ہے۔ جہاں ڈرامہ ختم ہوتا ہے...... پردہ گرنے سے چند لمحے پہلے کے آخری مکالمے....

ولادیمیر۔ اچھا؟ تو کیا ہم چلیں،
ایسٹراگن۔ ہاں آؤ چلیں....
(وہ حرکت نہیں کرتے......)

گوڈو کا انتظار ختم نہیں ہوتا۔ اور فیض صاحب کی نظم تنہائی میں بھی ــــ
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔
کی شدید مایوسی کے باوجود ــــ انتظار رہتا ہے...... تنہائی اسی طرح مکمل ہوتی ہے......

(تنہائی کے بارے میں محمد حسن عسکری مرحوم نے لکھا تھا کہ اردو میں لے دے کر چند نظمیں ہیں۔ جن میں ایک فیض صاحب کی تنہائی ہے... میں ذرا محتاط ہوں۔ اس لیے کہوں گا کہ یہ نظم ــ اپنے موضوع کے حوالے سے آج کے انسان کی تنہائی پر اردو میں سب سے اچھی اور مکمل نظم ہے اور فیض صاحب کی شاعری کے مجموعی مزاج سے بہت مختلف ہے.... لیکن یہ نظم بھی انہی فیض صاحب کی ہے۔ جو انسانوں کی محبت اور ان کے بہتر مستقبل کے شاعر ہیں۔ اور وہی انسان کی تنہائی پر ایسی نظم کہہ سکتے تھے۔

خالد حسن

مرے دل مرے مسافر

لندن ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں فیض صاحب بار بار آتے ہیں۔ محض ایک مرتبہ انہوں نے دیارِ غیر میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا جب بھی نگاہ انتخاب لندن پر پڑی یہ ۱۹۶۱ اور وغیرہ کی بات ہے لیکن فیض صاحب پھر یہاں سے واپس چلے گئے۔ ان کی نظم

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دلربا کے نام پر خالی سبو کریں

اسی زمانے میں لکھی گئی تھی میں یہ تصور کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نظم لندن کے کسی P 6 B میں عالم تنہائی میں لکھی گئی۔

لیکن فیض صاحب اور تنہا! موصوف کبھی لندن میں اکیلے نہیں ہوتے آشنا اور نا آشنا بھانت بھانت کے لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں میں آج تک دونوں اقسام کا فرق نہ پہچان سکا کیونکہ فیض صاحب کسی کو اجنبی سمجھتے ہی نہیں۔ اپنے دوستوں دشمنوں اور اجنبیوں کے لیئے ان کی گرمجوشی اور دردمندی لندن کی بارش کی طرح ہے جو سب پر یکساں برستی ہے۔ لندن کے گلی کوچوں سے ان کی شدید جانکاری اور ناموں اور چہروں کو یاد رکھنے کی صلاحیت، کی طرح انکا سنس اف ڈائریکشن بھی خاصا حیران کن ہے۔ لندن ایک لامتناہی شہر ہے خصوصاً اگر آپ اس میں کھو جائیں جو میرے ساتھ بالخصوص اس کے مشرقی اور جنوبی مغربی حصوں میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ چند سال قبل فیض صاحب کو کرسٹل پیلس سے آگے ایک صاحب کے گھر پہنچاتے ہوئے

میں راستہ بھول گیا نقشے کے مطالعے نے مزید گڑبڑا دیا بحیثیت ایک دیرینہ لندن،
لو اسی کچھ دیر تک تو میں نے ظاہر کیا کہ راستے سے بخوبی واقف ہوں مگر فیض صاحب
ذرا بے نیازی سے سامنے کا جائزہ لیکر بولے" ناک کی سیدھ میں نکل جاؤ، پھر اس
طرف مڑو۔ پھر ادھر" اور انکی ہدایت پر چل کر ہم واقعی عین منزل پر جا پہنچے۔
سال گزشتہ موصوف کو ہائی گیٹ سے جارہا تھا دہری شاہراہ پر پہنچ کر پھر بھٹکا
خیال تھا فیض صاحب نے نوٹس نہ کیا ہو گا۔ کہنے لگے "بھئی اگر تم داہنی طرف نہ مڑے
تو اوکسفرڈ پہنچ جاؤ گے"۔ فیض صاحب اپنے ایام جوانی سے یہاں آتے رہے ہیں
گو میں بہت سے حضرات کو جانتا ہوں جن کی واقفیت اتنی ہی ہونی چاہیئے مگر وہ آپ
کو نائیٹس برج سے ریجنٹ اسٹریٹ تک نہیں پہنچا سکتے۔
اس موسم سرما میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے فیض صاحب کے مانوس لندن
کو ان کے لئے بدل کے رکھ دیا شاید وہ اب بار بار یہاں آنا پسند بھی نہ کریں ان
کے لئے اس حقیقت کو قبول کرنا مشکل ہے کہ ایک جیتا دوست جس کی وجہ سے
لندن ان کے لئے اتنا کچھ تھا، ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ اس فروری کے
ایک یخ بستہ دن محمد افضل اس دنیا سے اٹھ گئے۔ فیض ہمیشہ مرحوم کے ہاں ٹھہرتے
تھے محض کچھ عرصہ قبل انہوں نے ماجد علی اور زہرہ نگاہ کے نائیٹس برج والے
فلیٹ میں قیام کرنا شروع کیا تھا۔ میرا خیال ہے چونکہ محمد افضل کی صحت خراب رہنے
لگی تھی فیض صاحب ان پر اپنی میزبانی کا بوجھ نہ ڈالنا چاہتے تھے پچھلی گرمیوں میں
جب وہ کینیڈا گئے ایس افضل کے ہاں ٹھہریں میں افضل سے لاہور میں واقف نہ
تھا کیونکہ وہ میرے زمانے سے قبل پاکستان کو خیر باد کہہ چکے تھے لیکن ان کے متعلق
سن رکھا تھا۔ ٹریڈ یونین تحریک میں ان کے بہادرانہ شرکت کی اہمیت سے بھی باخبر تھا
ملاقات پر کلبیت آمیز حسن مزاح کا مالک اکل کھرا شخص پایا خاموش طبع اور چڑچڑا۔
میں نے فیض صاحب سے پوچھا۔ "بھئی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دراصل بیچارہ
کافی مدت سے بیمار رہنے لگا ہے اس وجہ سے اسے اپنے معمولات میں ردوبدل
کرنا پڑا علاج معالجے اور پرہیز وغیرہ کی وجہ سے ذرا جھنجھلاتا ہے حقیقت میں
بہت مختلف انسان ہے پہلے تو بالکل شعلہ جوالہ تھا اور بیحد کمیٹڈ ہے"

مغربی ممالک میں افضل جیسے متعدد لوگوں سے مل چکا ہوں۔ ایسے اصول پرست لوگ جو پاکستان کو ایک ترقی پسند اور روشن خیال ملک دیکھنا چاہتے تھے مگر جنہوں نے مایوس ہو کر پردیس میں سکونت اختیار کر لی وقت کے ساتھ ساتھ ان کی کلبیت میں اضافہ ہوتا رہا مالی حالات روشن تر ہوتے گئے لیکن کسی نہ کسی طور پر بحیثیت انسان ان کا قد کم ہو گیا۔ افضل بھی انہیں لوگوں میں سے تھے لیکن فیض صاحب سے ان کی دوستی بہت گہری تھی دونوں ایک کمرے میں گھنٹوں چپ چاپ بیٹھ کر بھی ایک دوسرے سے گویا رہ سکتے تھے۔ ایک پرانی اور شدید دوستی ہی اس نوع کی کیمیا کی تخلیق کر سکتی ہے۔

افضل وفات پا چکے تھے۔ فیض صاحب اس وقت لندن ہی میں تھے میں وہاں نہ تھا۔ اس لئے مجھے معلوم نہیں انہوں نے اس صدمے کو کس طرح سہا۔ ایک دوست کا کہنا ہے کہ لوٹ سے گئے۔ چپ لگ گئی۔ اسی اداسی کے عالم میں بیروت واپس گئے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ کیونکہ جب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے رحلت فرمائی تب بھی فیض صاحب کا یہی حال ہوا تھا ایک عجیب قسم کی خاموشی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایسی صابر خاموشی جسے بے پایاں الم جنم دیتا ہے میں نے صوفی صاحب کا تذکرہ چھیڑا۔ انکا انداز ان کے ساتھ گزاری ہوئی شامیں ان کی شاعری۔ انکا مزاح۔ انکا افلاس جس میں انہوں نے ساری عمر گزاری۔ اور جسے انہوں نے ایک درویشانہ صوفیانہ رنگ میں قبول کر لیا تھا۔ صوفی صاحب کے متعلق کہنے کو اتنا کچھ تھا وہ فرداً فرداً ہم سب کے لئے اتنے کچھ تھے۔

بالآخر فیض صاحب نے بات کی کہنے لگے "ہم لوگ محض عطائی تھے۔ AMATEUR تھے۔ صوفی صاحب استادِ فن تھے۔ ماسٹر۔ جب بھی کوئی شک شبہ ہوتا ان کے پاس پہنچتے۔ زبان محاورہ۔ ڈکشن۔ SYNTAX۔ روزمرہ بنانے والے تھے چلے گئے۔ اب کس کے پاس جایا جائے گا۔

فیض صاحب جیسا کہ ان احباب کو معلوم ہے کبھی "میں" استعمال نہیں کرتے یا تو وہ غیر شخصی "ہم" کہتے ہیں۔ انگریزی کا THIRD PERSON INDEFINITE جب وہ کہہ رہے تھے۔

یا۔ WHEN ONE WAS IN DOUT ONE WOULD GO TO HIM.

ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کا اپنا استاد دنیا سے اٹھ گیا۔ جس کے قول فیصل پردہ اعتماد کرتے تھے اور فن شاعری پر حرف آخر سمجھ کر وہ قبول کر سکتے تھے۔

فیض صاحب لندن پہنچ کر چند لوگوں کو فون کرتے ہیں۔ میں انتہائی انکسار کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں فون کی گھنٹی بجتی ہے میں رسیور اٹھاتا ہوں۔ ہلو۔؟ میں پوچھتا ہوں: "بھئی فیض" سارے کام کاج چھوڑ کر فیض صاحب سے ملنے کے لئے لپکتا ہوں۔ فیض صاحب سے ملاقات میں جو اعزاز اور سربلندی مضمر ہے مجھے اس پر ہمیشہ سے فخر رہا ہے۔

فیض صاحب بے پایاں خلوص اور محبت کے آدمی ہیں بغض و عناد اور کینے سے نا آشنا۔ افسانہ نگار اشفاق احمد نے ایک بار انکو سلامتی صوفی کا لقب دیا تھا ساری عمر جسقدر گالیاں فیض صاحب کو دیگئی ہیں جتنا ان کو بدنام کیا گیا ہے اور جسطرح انہوں نے اس لعنت و ملامت کا کبھی جواب نہیں دیا اس کی بنا پر ان کو یقیناً ایک صوفی سلسلے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

فیض صاحب کو خوب معلوم ہے کہ جو لوگ ان کے قدموں میں بیٹھنے کے لئے پیش پیش رہتے ہیں وہی ان کی عدم موجودگی میں ان کے لئے کمینی اور گھٹیا باتیں کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے لندن میں مجھ سے فرمایا کہ فیض بحثیت شاعر گھٹیا چاند ہیں اب ان کے پاس کچھ کہنے کو نہیں رہا اور جو کہہ رہے ہیں بری طرح کہہ رہے ہیں چند روز بعد ہی میں نے ان صاحب کو خوشامدانہ عجز کے ساتھ فیض صاحب کے قدموں میں بیٹھے دیکھا اس شام بی بی سی کی ایک خوشگوار محفل میں میں نے فیض صاحب سے اس شخص کی منافقت کا ذکر کیا مسکرا کر بولے " پریشان مت ہو۔ اس قسم کی باتیں میں پچھلے چالیس سال سے سن رہا ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"لیکن آپ کو پتہ ہے ایسے لوگ کس قدر ریاکار اور منافق ہیں؟" میں نے دہرایا چونکہ فیض کسی کو برا نہیں کہتے نہ غیبت میں شامل ہوتے ہیں اس لئے مسکرا کر خاموش رہے۔

فیض صاحب کی بے پناہ قوت برداشت کا مظاہرہ بھی لندن میں ہوتا رہتا ہے ایک صاحب ہیں جو متواتر بے تکان بولتے ہیں اور ہر موضوع پر بولتے ہیں جو بات ان

کے ذہن میں آجائے اس پر انمنائی تقریر شروع کردیں گے۔ سوویٹ فارن پالیسی انگلستان کا بیہودہ موسم تازہ ترین کامیڈ۔ NO SEX PLEASE, WE ARE BRITISH کوئی بھی موضوع ہو انہیں بولنے سے غرض۔ ایک روز بی بی سی کلب میں انہوں نے فیض صاحب کو پکڑ لیا۔ دو گھنٹے تک فیض صاحب نے نہایت صبرو استقلال کیساتھ انہیں جھیلا۔ اسی طرح لندن میں اردو کے تشاعروں سے بھی انکا پالا پڑتا ہے ایک تشاعرے اپنے مجموعہ کلام (جو اپنے خرچ سے لندن میں چھپوایا تھا) کے جشن اجراء کی متعدد تقریبیں منعقد کیں یہ حضرت فیض صاحب پر بھی کرم کرتے ہیں اور فیض صاحب نہایت صبر اور سکون اور حیرت انگیز اخلاق کے ساتھ انکا کلام بلاغت نظام سنتے رہتے ہیں۔

فیض صاحب عموماً سیاستدانوں کے مداح نہیں ہیں۔ ان کے متعلق خوش فہمیاں نہیں رکھتے (انکا خوب تجربہ ہے) لیکن چند ہستیاں مستثنیٰ ہیں۔ میاں افتخار الدین سے انکا بہت گہرا رابطہ تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے میاں صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان کس سمت جارہا ہے۔ انہوں نے تبھی جدوجہد کی کوشش کی بہ ایسے لوگ کی مخالفت کی وجہ سے ذاتی مفاد اور بددیانت حصول اقتدار جن کا واحد مقصد تھا میاں افتخار الدین کی کاوش ناکام رہی اگر پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد آزاد پاکستان پارٹی کو مسلم لیگ کے ملبے پر استوار کرنے کے مواقع دیے جاتے تو آج ملک کی تاریخ مختلف ہوتی فیض صاحب سہروردی کے متعلق بڑے پیار سے بات کرتے ہیں نے ان کو یاد دلایا کہ سہروردی کے انتقال کے موقع پر ایک مغربی اخبار نے (مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا ہے) لکھا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو دو کڑیوں نے ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا تھا ایک حسین شہید سہروردی اور دوسری پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز۔ اخبار نے مزید لکھا کہ پتہ نہیں پی آئی اے دونوں حصوں کو کب تک اکٹھا رکھ سکے گا۔ ممتاز حسن مرحوم کہا کرتے تھے۔ اگر یہ WEST WING ہے

اور وہ EAST WING تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چڑیا کہاں ہے؟

میں نے بھی ان سے پوچھا اگر ان کو اس سوال کا جواب معلوم تھا۔ خاموش رہے۔ فیض صاحب نے ایسا لگتا ہے ساری زندگی دوستیاں استوار رکھنے میں

گزاری ہے - ایک دفعہ جو ان کے حلقہ احباب میں شامل ہو جائے اس کے لئے ان کی محبت میں کبھی کمی نہیں آتی - لندن میں ایک شام ہمیشہ فیض الحسن چودھری کے ساتھ گزارتے ہیں۔ "حمید اختر کا لدھیانوی کراوڈ" مجھ سے تشریح کی پچھلی مرتبہ جب فیض صاحب کی لڑکیاں بھی لاہور سے آئی ہوئی تھیں فیض نے الحسن صاحب کے ہاں EALING میں ایک طویل شام گزاری بیروت میں فیض صاحب کی طبیعت ناساز رہ چکی تھی میڈیکل ٹسٹ ٹھیک نکلے مگر ڈاکٹروں نے شراب اور سگرٹ کا کوٹا مقرر کر دیا چنانچہ فیض سن کے ہاں ایلس اور سلیمہ اور منیزہ فیض صاحب کی چوکیداری میں مصروف تھیں۔

فیض صاحب بے تحاشا سگریٹ پیتے ہیں - جو برانڈ مل جائے - تیزی سے چند کش لیکر سگریٹ راکھدانی میں بجھا کر فوراً دوسرا سگا لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ تقریباً غیر شعوری طور پر سگریٹ پیتے ہیں اور اس سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔

لیکن اس شام ایلس سلیمہ اور منیزہ کی کڑی نگرانی کی وجہ سے موصوف کے سٹائل میں فرق آ رہا تھا۔ "ابو بیروت میں خاصے بیمار پڑ گئے تھے" سلیمہ نے کہا، "کبھی کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی۔" فیض صاحب نے جواب دیا وہ اپنے متعلق ہمیشہ اس گول مول غیر واضح انداز سے بات کرتے ہیں گویا کسی اور کا تذکرہ ہو۔

پچھلے جاڑوں میں ماجد علی کے ہاں ایک بقراط فیض صاحب کو بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انکا یعنی فیض صاحب کا روسیوں پر کتنا گہرا اثر ہے فیض صاحب کو چاہیئے روسیوں سے فرمائش کریں کہ افغانستان سے واپس چلے آؤ۔

یا TIE GO GARCIA پر بم گرا دو یا اسی قسم کی انٹ شنٹ۔" ذرا ایک بات بتا لینے دیجئے۔" فیض صاحب نے کہا، روسی سیاست پر سنجیدہ گفتگو یا سیاسی بھیَد محض پارٹی ممبروں تک محدود رکھتے ہیں۔ میں پارٹی ممبر نہیں ہوں۔ کبھی نہیں رہا یہ ان کے لئے بہت اہم چیز ہے اگر آپ برادرانہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں، تو آپ سے ان کا برتاؤ مختلف ہو گا۔ تب آپ ان سے ایک دوسری سطح پر بات کریں گے۔ آپ اسے انکا HRNG کہیں یا کچھ اور بہر حال پارٹی ان کے لئے فوقیت رکھتی ہے میری وہ بہت عزت کرتے ہیں بہت اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ کیونکہ میں ایک شاعر ہوں اور لینن پیس پرائز حاصل کر چکا ہوں لیکن سیاسی گفتگو وہ پارٹی ممبروں کے ساتھ ہی کرتے ہیں۔" ایک صاحب

کا خیال تھا کہ فیض صاحب اپنی مرضی سے ماسکو کے چکر لگاتے رہتے ہوں گے۔ جواب دیا۔
" نہیں بھئی روسی بڑے پر تکلف لوگ ہیں اور ان معاملات میں ضابطے کے پابند
جب وہ باقاعدہ مدعو کریں تبھی کوئی وہاں جاتا ہے ایسا نہیں کہ آپ ماسکو ایر پورٹ پر جا
اترے اور فون کیا او ہائی ساشا۔ میں آ گیا آ کر مجھے پک اپ کر لو لاؤنج میں بیٹھا ہوں"
میں فیض صاحب کو اپنے بچپن سے جانتا ہوں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی وساطت
سے وہ میرے والد کے دوست تھے تاثیر میرے والد ڈاکٹر نور حسین کشمیری کے پرانے
اور گہرے دوست تھے مجھے بچپن کی یاد ہے فیض صاحب گلمرگ میں ہمارے ہاں آئے
تھے ہمارے درمیان ایک نوع کا باپ بیٹے کا رشتہ استوار ہو چکا ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ
نہیں۔ تقسیم کے بعد ہم لوگ سیالکوٹ میں آ بسے جو فیض صاحب سے تعلق خاطر کی ایک
اور کڑی ہے یہ شہر فیض صاحب کی رگ و پے میں بسا ہوا ہے۔ یہیں وہ پلے بڑھے
اسکول اور کالج گئے۔ ان کے والد انہیں مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی کی خدمت میں لے
گئے تھے انہوں نے پہلے مولوی میر حسن کے مکتب میں اور اس کے بعد مرے کالج
میں عربی پڑھی مولوی ابراہیم سے قرآن، حدیث اور فقہ کا درس لیا لندن میں مجھے بتایا کہ
مولوی ابراہیم اس وقت ہندوستان کے جید ترین علماء میں سے تھے۔
فیض صاحب نے بچپن میں قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا اور تقریباً نصف حصہ
حفظ کر لیا وہ ہمارے آدھے سے زیادہ ملاؤں سے بہتر علم کلام مجید کا رکھتے تھے۔
اور اس کے حوالے دیتے رہتے تھے۔
چند سال قبل وہ سیالکوٹ واپس جانا چاہتے تھے اس شہر کی اندھیر پیچدار پتھریلی
گلیوں کے لئے شدید نوسٹیلجیا ہے اہل سیالکوٹ اب بھی ان کو اپنا بیٹا گردانتے ہیں
فیض کے لڑکپن کے ایک چہیتے دوست خواجہ فیروزالدین فیض کا چند سال قبل انتقال ہو
گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے فیض کا نام تک اپنے نام میں شامل کر لیا تھا۔ ویسے سیالکوٹ
میں وہ اپنے انگریزی نما انداز اور گورے چٹے رنگ کی وجہ سے فیروز ٹامی کہلاتے تھے
لندن میں ایک بار مجھے فیض صاحب نے بتایا کہ کالج میں انکا ایک مضمون ایسا عمدہ سمجھا
گیا تھا کہ اسے نوٹس بورڈ پر لگا دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور مضمون علمیت
سے بھرپور رقم کیا لیکن اسے بہت کم نمبر ملے ان کے انگریز استاد نے کہا "پہلا مضمون

جو تم نے لکھا اور بجا تھا اگر مرتبہ تم نے دوسروں کے خیالات دہرا دیے ایسا نہ کرو اور بجنل ذہن و دماغ کے مالک ہو دوسروں کی تقلید نہ کرو۔

میرا خیال ہے فیض نے کبھی دوسروں کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرائیں میں نے اکثر ان سے کہا ہے کہ کلاسیکل اردو شاعروں کا ایک انتخاب تیار کریں۔ انہوں نے کیا تھا لیکن اس کا مسودہ (نقل موجود نہیں تھی) ایک خاتون لے گئیں جو نیویارک میں رہتی تھیں پھر ان محترمہ نے شادی کر لی۔ اور مسودہ گنوا دیا ثابت ہوا کہ شاعری، اور شادی ایک دوسرے کو راس نہیں آتے۔

فیض صاحب اقبالؒ کے بہت زبردست معتقد ہیں۔ لیکن زندہ پائندہ اقبال کے۔ اس اقبال کے نہیں جسے قلم فروشوں، بوگس ناقدوں اور خود ساختہ نظریہ پرستوں نے ایک قدیم ڈھانچے میں تبدیل کر دیا ہے۔ فیض صاحب اکثر کہتے ہیں کہ وہ ایک طویل دیباچے کے ساتھ انتخاب اقبال شائع کریں گے۔ ان کا کہنا ہے "اسلام اور دوسرے بنیادی سوالات پر علامہ مرحوم کے اصل نظریات ان کی انگریزی تحریروں میں موجود ہیں غالباً اسی وجہ سے انہوں نے ان خیالات کو انگریزی میں قلمبند کیا تاکہ وہ رجعت پسندوں کی دسترس سے باہر رہیں، گو اب رجعت پسندوں کی اکثریت ہمارے ہاں انگریزی بولتی ہے!

فیض صاحب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ ان کے بچپن میں ان کے والد انکو انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں لے گئے تھے۔ علامہ اقبال بھی اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ فیض سے تلاوت قرآن کروائی گئی" میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ایک اونچی میز پر کھڑا کیا گیا۔ جب میں تلاوت کر چکا تو اقبال نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا تم کتنے ذہین اچھے بچے ہو۔ میرے والد کو علامہ مرحوم سے نیاز حاصل تھا۔"

فیض بہت تنہا ہیں۔ انہیں پاکستان بیحد یاد آتا ہے پچھلے چند برسوں میں دوسرے ملکوں میں انہوں نے جتنے آفر ٹھکرائے ہیں وہ ان سے کمتر انسانوں کو للچا سکتے تھے۔ گزشتہ سال دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی ان کو وزٹنگ پروفیسر شپ قبول کرنے کے لئے مصر رہی انہوں نے مستقل انکار

انکار کیا۔ "ہندوستان تھوڑے دنوں کے لئے جانا دوسری بات ہے" انہوں نے مجھ سے کہا۔ "لیکن اس قسم کی پیش کش قبول کرنا ہمیشہ کے لئے خود اختیاری جلاوطنی اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔"

پچھلے سال ہی راقم الحروف کو بھی کسی نے دہلی یا بمبئی میں ایک ملازمت تجویز کی تھی میں نے فیض سے پوچھا کہنے لگے "نہیں ایسا نہ کرنا چاہیے آئس لینڈ چلے جاؤ لیکن ایک دفعہ اگر تم نے ہندوستان میں کوئی ملازمت کرلی تو تم پاکستان سے بندھے اپنے نال کے رشتے کو قطع کردوگے۔"

پچھلے سال ایک روز فیض نے مجھے فون کیا کہ صبح ان کو پک اپ کرلوں۔ "بھئی کل آجانا۔ ہاں بھئی کوئی گیارہ بجے۔" وہ ہیرڈز کے قریب ماجد علی کے ہاں مقیم تھے فیض کو میں نے کبھی شاپنگ کرتے نہیں دیکھا۔ لندن آئے ہوئے کسی پاکستانی کے لئے کتنا کہ وہ خریداری نہیں کرتا اسے یقیناً نوبل پرائز کا حقدار بنا سکتا ہے۔

میں وقت مقررہ پر پہنچا "چلو پکچر دیکھ آئیں" فیض صاحب بولے۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ میں نے کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ آپ سینما بھی دیکھتے ہیں: "آپ سینما عموماً نہیں دیکھتے نا۔ میرا مطلب ہے کہ" میں نے بڑبڑا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ بیروت میں کسی اور دلچسپی کے فقدان کی وجہ سے موصوف کو سینما دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

اب ہم گھر سے نکلے۔ مگر ہر جگہ پکچر شروع ہو چکی تھی۔ یا بہت دیر میں شروع ہونے والی تھی اسی طرح آوارہ گردی کرتے ہم نے خود کو یوسٹن روڈ پر پایا۔ طے کیا کہ کچھ کھایا جائے۔ فیض صاحب بولے وہ ایک جگہ جانتے ہیں جہاں بڑھیا چاٹ۔ حلوہ پوری اور اصلی پنجابی لسی ملتی ہے۔ چنانچہ ہم لوگ ایک ریسٹوران میں پہنچے کہ نام اس کا دیوانہ تھا۔ فیض صاحب نہایت محظوظ ہوئے۔ "بھئی واہ کیا نام پایا ہے۔ دیوانہ!" اور میں نے سوچا کہ اس لفظ "دیوانہ" نے اردو فارسی شاعری میں کس قدر اودھم مچائی ہے۔ اور یہ آفت جوتنے میں خود فیض کا کتنا بڑا ہاتھ تھا!

فیض کی معیت میں انسان کو اجنبیوں سے نہایت پرتپاک علیک سلیک کی عادت پڑ جاتی ہے فیض سب سے اس طرح ملتے ہیں۔ گویا برسوں کا یارانہ ہے نام

یاد نہ رہے چہرے کسی کے بھولتے نہیں۔

لندن میں پاکستان کے لئے ان کا نوسٹیلجیا زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ۔ ریسٹوران پرانے اپیریل ناتے۔ پاکستان خصوصاً لاہور کے نوسٹیلجیا کے ارتفاع کی خاطر ایسی جگہوں پر جاتے ہیں جو بقول بی بی سی والے اطہر علی غائص مزنگ میں مشرقی لندن کا لاہور کباب ہاؤس" اس قسم کا ایک "مزنگ" ہے ماسکو میں ان کی ستردیں سالگرہ منائے جانے والی تھی وہاں جاتے ہوئے لندن میں رکے تو فرمائش کی۔ لاہور کباب ہاؤس چلو۔

مشرقی لندن میں میرے دو دوست رہتے ہیں۔ ڈار اور، دُرّانی ڈار سیالکوٹ کا ایک لمبا تڑنگا خوبصورت کشمیری ہول سیل گارمنٹ ٹریڈ میں ہے۔ اپنے محلے کا دادا بھی ہے اور فیض بھگت بھی میں نے فون کیا۔ رات گئے پہنچے مگر ڈار نے لاہور کباب ہاؤس کھلوا دیا۔ بالکل لاہور کا سا لطف آ گیا بس اس کی کسر تھی کہ لاہور میں ہوتے تو باہر نکل کر مولا بخش سے ایک ایک بنارسی پان بنوا کر کھاتے۔

اس سے قبل دُرّانی، کہ پوستین اور چرمی ملبوسات کا تاجر ہے ہم کو ایسٹ لندن کے مشہور مے خانے JACK THE PIPER. میں لے گیا تھا۔ یہ علاقہ جیک کے زمانے سے ابتک زیادہ نہیں بدلا ہے۔ اندران اخبارات کے عکس آویزاں ہیں جن میں مسٹر جیک کی سرجنوں جیسی مہارت کے "کارناموں" کی خبریں شائع ہوئی تھیں آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوا۔ دیوانہ قاتل کون تھا۔ کیونکہ وہ کبھی پکڑا نہ جا سکا۔ لیکن اہل ایسٹ لندن نے اسے یاد رکھا ہے ہم نے اس کے نام کا جام پیا اور فیض نے اس نامور جنٹلمین کے نام کی تختی کارناموں کی تفصیلات اور جزیں ملاحظہ کیں ہم سب متفق تھے کہ بہر حال وہ جنٹلمین ضرور تھا۔ اور خطاب یافتہ! برطانوی اپر کلاس زندہ باد!!

"انجیل میں جو عمر طبعی لکھی ہے آپ اس کو پہنچ چکے" میں نے کہا (فیض اپنی ستردیں سالگرہ سے چند ہفتے قبل لندن آئے تھے) کسی نے دریافت کیا وہ خوش رو نوجوان خاتون کون تھیں جن کے ساتھ کل آپ لنچ نوش جان کر رہے تھے۔

"اس سے قبل کہ اس خاتون کا اتہ پتہ بتاؤں آپ حضرات کو آگاہ کرتا ہوں

کہ میں اس شعبے سے ریٹائر ہو چکا ہوں "کسی نے ان کے اعلان پر کان نہ دھرا۔ عورتوں کو فیض صاحب نے ہمیشہ مسحور کیا۔

برطانیہ آ کر برمنگھم بھی ہمیشہ جاتے ہیں جہاں وہ ہمیشہ میاں بیوی بادر اور نسرین کے ہاں قیام کرتے ہیں سلیم شاہد بھی برمنگھم میں موجود ہیں (پتہ نہیں کتنوں کو حفیظ ہوشیار پوری مرحوم کی وہ غزل یاد ہے جو کہا جاتا ہے کہ سلیم شاہد یا رضی ترمذی یا دونوں نے انسپائر کی تھی یا ان کے نام معنون کی گئی تھی) ضیاء محی الدین مع ناہید اسی شہر میں ہے اور ٹیلی ویژن پر اپنا شو HERE AND NOW. پیش کرتا ہے۔ اس بار میں نے فیض صاحب کو برمنگھم لے جانے کی پیش کش کی بولے "اوکسفرڈ کے راستے چلیں وہاں ایک ہمدم دیرینہ کو بھی دیکھ لیں گے۔ میں ہمیشہ ان سے ملنے کا ارادہ کرتا رہا ہوں"

گیارہ بجے صبح لندن سے چلے برفباری شروع ہو گئی اور میری کار میں اسنو ٹائر نہ تھے۔ سفر خاصا دشوار گزار تھا مگر فیض صاحب نے پرواہ نہ کی (ایلس نے ایک بار بتایا کہ ایک رات بیروت میں ان کے پڑوسی کے مکان میں بم پھٹا فیض جاگے نظر دوڑا کر دیکھا کہ کمرہ صحیح و سالم ہے اور فوراً پھر سو گئے)

اوکسفرڈ کے اس پریشان کن راستے میں میں نے تاج ملتانی کی گائی ہوئی خواجہ فرید کی کافیاں کیسیٹ پلیر میں لگا دیں ہم کافیاں سنتے رہے اور برف گرا کی۔ اچانک فیض صاحب نے کہا "یہ اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے" "جی ہاں اس میں ایک مصرع عشق ہے اسی سدا پیر" میں نے کہا۔

فیض بہت متاثر تھے میں نے ٹیپ دوبارہ لگایا "غور سے سنو" فیض صاحب نے کہا تم کو پتہ چلے گا کہ پنجاب کے اس عظیم شاعر نے عربی اور فارسی الفاظ کس افراط سے استعمال کیئے ہیں اس نکتے کو نجم حسین سید قسم کے لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور پنجابی زبان کی تطہیر پہ مصر ہیں ان کو ان استادوں کا کلام پڑھنا چاہیئے" میں نے کہا "خواجہ فرید نے اپنی ایک کافی میں ایک انگریزی لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ دکھاں دی اپیل اے۔" "یہی تو بات ہے ساری" فیض نے جواب دیا "شاعر کے لئے اہم ترین شے شاعری ہے وہ نہ گرامر کا ماہر ہے نہ فرہنگ نویس جو

زبان اس کے لئے اوزار ہے ایک مصالحہ جسے وہ اپنی تخلیق کے لئے استعمال میں لاتا ہے زبان اس کے زیر نگیں ہے وہ زبان کا غلام نہیں۔

ہم صحیح و سالم اوکسفرڈ پہنچے۔ خواجہ فرید نے برف کے جھکڑ میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ منظر اور ماحول ان کے ان تپتے ریگستانوں سے اتنا مختلف تھا جہاں انہوں نے اتنی شدت احساس اور آب و تاب والی شاعری تخلیق کی تھی۔

ہم حبیب فیض کا مکان تلاش کر کے وہاں پہنچے۔ وہ ایک معمر خاتون نکلیں جو دوران جنگ دلی میں رہ چکی تھیں برطانوی مصنف گائی ونٹ GUY WINT سے شادی کر لی تھی شوہر کا چند سال قبل انتقال ہو گیا ان کی لڑکی اندرا جوشی مشہور ایکٹرس ہے۔

مسز ونٹ بہت دل پذیر خاتون تھیں بدھ مذہب اختیار کر چکی تھیں۔ اوکسفرڈ میں بدھ ازم اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کے مضامین پڑھاتی ہیں۔ گیان دھیان کی ماہر ہیں وہ اور فیض صاحب پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے۔ ڈبل روٹی اور پنیر کھایا مسز ونٹ جوانی میں حسین رہی ہونگی۔

"ہاں تھیں" فیض صاحب نے بعد میں بتایا دلی میں خاصا تہلکہ مچا رکھا تھا"

برمنگھم میں بھی فیض صاحب کا قبیلہ زوروں میں جا رہا تھا آمد کی خبر پھیلی اور یار لوگوں کا تانتا بندھ گیا ، OPEC کے ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ مگر فیض صاحب فیضان محبت عام اور لا متناہی ہے ستردیں سالگرہ سے ذرا قبل میں نے اور اطہر علی نے فیض صاحب کے ساتھ ایک بڑی جذباتی شام گزاری ہم فائیٹس برج کے ایک شراب خانے JERKS HEAD. گئے۔ وہ بڑا آرام دہ PUB ہے جہاں جاڑوں میں آتشدان میں آج بھی لکڑی کے کندے جلائے جاتے ہیں۔ اس شام فیض کی شدید آرزو تھی کہ کاش وہ اس وقت لاہور میں ہوتے" بچیاں کیا کہتی ہیں" اطہر علی نے پوچھا جو" کہتی ہیں زیادہ کارآمد نہیں۔ کہتی ہیں جو آپ کی اصل مرضی ہو وہی کیجیے"

شام گزرتی گئی۔ فیض صاحب لاہور کو نہ بھول سکے" وہاں سب میرے دوست ہیں" عبداللہ ملک اور حمید اختر اور مظہر علی خاں اور طاہرہ اور سید واجد علی کا تذکرہ کرتے رہے (واجد علی نے ایک مرتبہ سید عابد علی کی مدد سے فیض صاحب کو" اعزازی شیعہ" بنا دیا تھا کربلا گامے شاہ لیجا کر فیض کے اپنے

تصنیف کردہ نہایت زوردار مرثیے پڑھوائے تھے) اور بہت سے لاہور ان کی ہڈیوں میں رچا ہوا ہے وہ ہمیشہ ان کے لیے انکا روشنیوں کا شہر تھا اور رہیگا۔

میں نے کہا: "آپ کو احساس ہے لوگ آپ کو کتنا چاہتے ہیں۔ آپ محض ایک شاعر نہیں ہیں اس کہیں زیادہ بہت کچھ ہیں۔"

شام گہری ہو رہی تھی اور ہم اداس ہوتے جا رہے تھے۔ اور تب میں نے دیکھا فیض صاحب کی آنکھیں نم ہوئیں اور ان کی آواز بدل گئی۔

"اچھا" انہوں نے ذرا دقت سے کہا پتہ نہیں لوگوں کی محبت میرے حصے میں اتنی کیوں آئی ہے۔ ONE IS ONLY A POET AFTERALL.

ہم خاموش رہے۔ فیض صاحب لاہور نہیں گئے ماسکو میں اُن کا جنم دن منایا گیا۔ بیروت میں ان کے جشن سالگرہ کا انتظام خود یاسر عرفات نے کیا لیکن وہ لاہور جانا چاہتے تھے پھر یہ معلوم کر کے بیحد متاثر ہوئے کہ پاکستان خصوصاً لاہور میں اُن کا جشن سالگرہ منایا گیا تھا۔

مجھ سے انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

IT IS NOT THAT ONE HAS NO FIGHT LEFT. IT IS ONLY THAT I AM NOT AS YOUNG AS I ONCE WAS. AND IT IS DIFFICULT TO TAKE PHYSICAL PUNISHMENT WHEN YOU ARE OLDER. THE SOUL IS WILLING BUT THE BODY IS NOT.

آزادی، مساوات، انصاف اور انسانیت کے لئے فیض کی شدید وابستگی کا شعلہ ہمیشہ بیحد تابناک رہا ہے۔ وہ ہمیشہ کے مردِ مجاہد ہیں لیکن ہر شخص کا جدوجہد کا طریقہ مختلف ہے چند HACK شاعروں کی طرح ہر موقع کے لحاظ سے "ملّی موسیقی" کی دھنوں پر کھٹ سے ترانے لکھ ڈالنا اگر شاعری اور حب الوطنی ہے تو فیض صاحب نہ محبِ وطن ہیں نہ شاعر۔ لیکن فیض احمد فیض سے زیادہ گہرے سوز و گداز اور دیش بھگتی اور رجائیت سے شرابور شاعری کس نے کی ہے۔؟ اور ۱۹۶۵ء کی لڑائی کے بارے میں انکا گیت "اٹھو اب ماٹی سے

اب اٹھو میرے لال" تو ایک شاہکار ہے۔

اس وقت شاعر اور انسان فیض احمد فیض کے دفاع کا موقع نہیں ہے۔ ان کو دفاع کی ضرورت نہیں۔ اور شاعر فیض کو انسان فیض سے جدا کرنا مشکل ہے۔ لیکن ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہی کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ فیض دراصل انقلابی نہیں ہیں۔ محض ایک شاعر ہیں اور ان کے چند COMMITTED دوستوں نے جن کو وہ "نہ" نہیں کہہ سکتے تھے۔ ہر حکومت کے دور میں کسی نہ کسی قضیے میں پھنسوا دیا۔ ڈاکٹر مرزا کی فیض صاحب سے انسیت سے قطع نظر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب فیض احمد فیض کے فلسفہ حیات ہی سے لاعلم ہیں کیونکہ فیض صاحب کی شاعری اور جس طور سے انہوں نے زندگی گزاری ہے۔ ان دونوں چیزوں میں حدِ فاصل کھینچنا ناممکن ہے۔

ترجمہ :- قرۃ العین حیدر۔

صلاح الدین حیدر
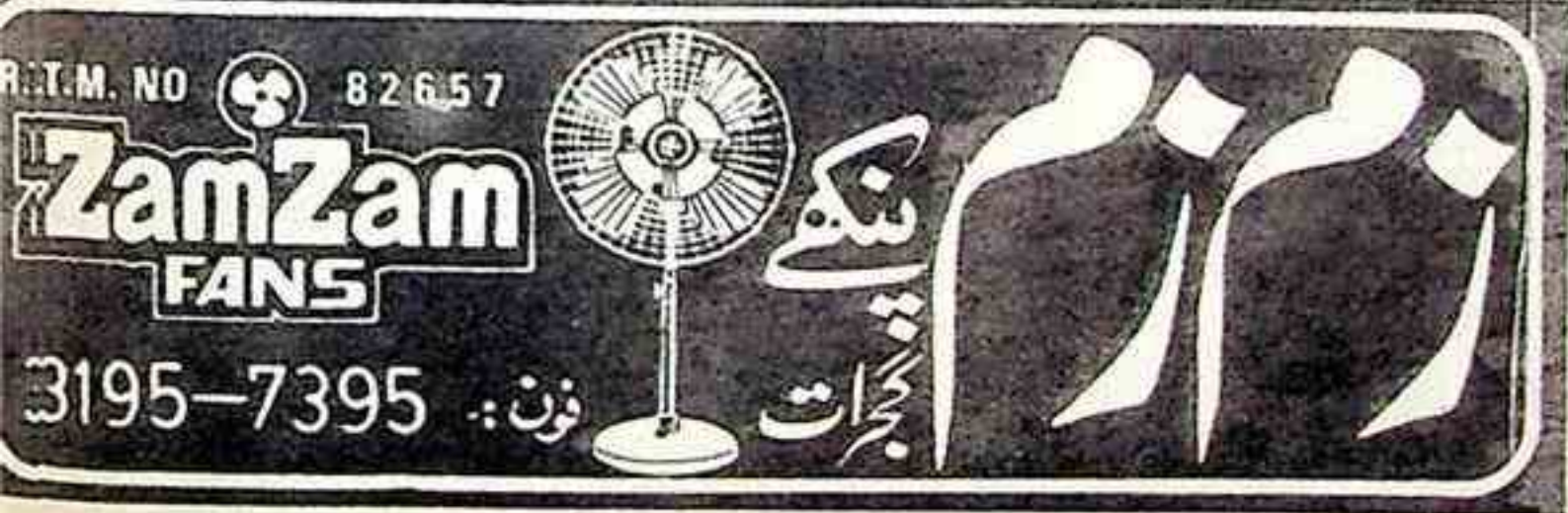
میزان ——— ایک مطالعہ

فیض صاحب کے تنقیدی مضامین اور تبصرے اسلوب اور مواد کے اعتبار سے حقیقت نگاری اور توازن کی عمدہ مثال کہے جا سکتے ہیں۔ فیض کی تنقیدی کاوشوں کا مجموعہ میزان کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں چھپ کر منظر عام پر آ گیا تھا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ تنقیدی حلقوں میں اس کتاب کی اتنی پذیرائی نہیں ہوئی جس طرح کہ ترقی پسند تحریک کے دیگر نقادوں یعنی احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین وغیرہ کی کاوشوں کو ہوئی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میزان کے مضامین کے مباحث کتاب کی اشاعت کے زمانے کے عام ادبی مباحث سے ایک حد تک مختلف سے نظر آتے ہیں۔ یہ زمانہ وجودیت اور ماورائیت کے مسائل سے لبریز تھا۔ لیکن فیض کو اپنے موقف پر اعتماد تھا۔ چنانچہ انہوں نے دیباچے میں اپنی مخصوص منکسر المزاجی کے باوصف فرمایا "ان تحریروں میں جگہ جگہ ترمیم و وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن میں نے ردوبدل مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ بنیادی طور پر مجھے ان تنقیدی عقائد سے اب بھی اتفاق ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے مولانا حالی کی مقدمہ شعر و شاعری کی طرح ایک اہم دستاویز ہے فیض نے بہت سادہ دھیمے لیکن سلگتے ہوئے اسلوب کے ساتھ اپنے قاری کو یہ بات پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کہ حسن یا جمالیات اور فنون لطیفہ کی تمام قدریں بنیادی طور پر معاشرے کی جڑوں سے پیوست ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے اگر ہم تاریخ کے عمل کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں مختلف معاشروں اور قوموں کے گوناگوں تضادات

نے آخر کار ثقافت، فن کی دنیا میں کسی نہ کسی خوبصورت امتزاج کو جنم دیا ہے۔ چنانچہ امیر خسرو کی شاعری ہو یا تان سین کی موسیقی یا شالیمار باغ کی روشیں یہ سب کسی نہ کسی حوالے سے سماجی تضادات کے عمل میں انسان کے باطن کی تہذیبی زندگی کے متحرک ردِ عمل کی یادگاریں ہیں۔

یوں فیض فن کی دنیا میں روایت سے بہت مانوس نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نظریہ فن کے مباحث میں ایک سے زائد بار اپنے اس موقف کا اظہار کیا تھا کہ زندگی کے بڑے تضادات ہی بڑے فن پاروں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ گویا بڑے فن کار تضادات کے ردِ عمل کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یعنی اہرمن کے طبل و دف چھنتے ہیں تو شوقِ زلیست کی شہنائیاں بجتی ہیں۔ متاعِ لوح و قلم چھنتی ہیں تو خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کا جواز بنتا ہے، زبان پہ مہر لگتی ہے تو حلقہ زنجیر میں زبان رکھنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے لیکن یہ شعری منطق ہے اور تنقیدی مباحث میں ارتداد یا انکار یا اقرار کی یہ منطق جوں کی توں قبول نہیں ہوتی، فیض تنقید کے منصب سے بخوبی آشنا ہیں چنانچہ وہ نہ تو شاعرانہ انداز سے بات کرتے ہیں اور نہ افراط کے اسلوب میں اپنے استدلال کو دوسروں پر مسلط کرتے ہیں۔ بقول قرۃ العین حیدر وہ بقراطیت یا   کی نفی کرتے ہیں اور دوستانہ اور مشفقانہ انداز سے فن کے بہت ہی نازک اور بنیادی سوالات کو زیرِ بحث لاتے چلے آتے ہیں۔

'میزان' میں انہوں نے فن کے نظریاتی مباحث کو بھی چھیڑا ہے، متقدمین کے افکار سے بھی بحث کی ہے۔ اور ہم عصر لوگوں کی تحریروں پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا پہلا مضمون ادب کا ترقی پسند نظریہ ۱۹۳۸ء کی تحریر ہے۔ جس میں فیض نے ترقی پسند نظریہ کو کلچر کے فروغ کے لیے ایک راستہ بتایا ہے اور کلچر کے فروغ کا منصب یہ بتایا ہے کہ سماجی اقدار کی ترتیب موزوں کی جائے۔ اسی مضمون میں فیض صاحب نے اس امر کا بھی برملا اظہار کیا ہے کہ ہر قسم کا ادب کوئی نہ کوئی پروپیگنڈا کرتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک پروپیگنڈا ابتر ہے اور دوسرا مضر (فیض کے اسی حوالے کو اور ان کے نظریہ ثقافت کو پیشِ نظر رکھ کر ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی میزان کا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ جو کہ فنون ۱۹۶۸ء جنوری، فروری میں طبع ہوا تھا) اسی طرح مضمون شاعر کی قدریں میں بھی انہوں نے ہر قسم کی جمالیاتی قدروں کو بنیادی طور پر سماجی قدریں قرار دیا اور اس ہمہ گیر سچائی کو بھی

تنقید کی زبان میں پیش کیا کا اگر کلام جمالیاتی متاثر کے اعتبار سے ناقص ہو تو یہ نقص کلام کی افادیت پر بھی اثر انداز ہو گا۔ مضمون "ادب اور جمہور" میں انہوں نے انسان کے اولین سماجی رویوں سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ادب کا ہر زمانے میں کسی نہ کسی طرح عوام سے ربط استوار رہا ہے۔ لیکن یہاں فیض کی قوت بیان اسی مرحلے پر کھٹکتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں "ادھر شیکسپیئر پیدا ہوا، ادھر عرفی ونظیری، اس کے بعد سماج کی بساط پر متوسط طبقہ کی صف آگے بڑھی۔ ادھر ورڈز ورتھ ڈکنز، ٹھیکرے پیدا ہوئے ادھر حالی اور اقبالؔ — اب جمہور کا طبقہ پیدا ہو رہا ہے"۔ یہ بیان غور طلب ہے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی پیدا ہوئی تو مغرب میں دولت بڑھی۔ مشرق میں گھٹی۔ ایک طرف مشین اور پہیے نے کرشمہ دکھایا دوسری طرف افلاس نے ڈیرا لگایا۔ مشرق کا متوسط طبقہ نوآبادکاروں کا غلام اور مغرب کا متوسط طبقہ جارحیت کے غرور سے بدمست، لیکن اس موازنے سے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ بڑا یا بھلا جیسا بھی درمیانہ طبقہ انگریزوں کے عہد میں برصغیر میں پروان چڑھا۔ اب کی نئی جمالیات اور اخلاقیات نے اسی طبقے میں جڑیں بنائیں۔

فیض نے ہماری تنقیدی اصطلاحات، فنی تخلیق اور تخیل اور خیالات کی شاعری جیسے موضوعات میں تخلیقی سرگرمیوں کے بعض بنیادی مسائل کی نشاندہی کی ہے انہوں نے اس اہم لسانی مسئلے کی طرف بھی توجہ کی ہے کہ زبان اسی صورت میں زندہ رہتی ہے جبکہ عام انسانوں کی زندگی سے اس کا رابطہ استوار ہو، دوسری صورت میں زبان متروک ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "جذبہ تخلیق میں لہو کی گرمی پیدا کرتا ہے، فکر و دماغ کی روشنی صناعت اور قدرتِ اظہار سے اس تخلیق کا ناک نقشہ اور نوک پلک سنوارتی ہے" گویا فن کار محض عاشق ہی نہیں ہوتا ایک معمار بھی ہوتا ہے، بے خطر آتشِ نمرود ہی میں نہیں کود پڑتا بلکہ کچھ سوچ سمجھ بھی لیتا ہے۔ اس طرح اقبال اور فیض دونوں تخلیقی قوتوں کو کسی نہ کسی شعوری مقصد سے مربوط اور ہم آہنگ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

شاعری کے بنیادی سوالات سے قطع نظر فیض فکشن کے متعلق بھی بڑے بنیادی سوالات سے بحث کرتے ہیں۔ انہوں نے عالمی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اردو کے اولین فکشن کے نقوش کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے، وہ ڈاکٹر احسن فاروقی کی طرح قوت استرداد ہی کو معیار نہیں بناتے بلکہ شرر، رتن ناتھ سرشار اور منشی پریم چند

جیسے فکشن نگاروں کا ہمدردی سے جائزہ لیتے ہیں اور ان وجوہات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے باعث پریم چند کے فکشن کو بھی ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کے ہم پلہ نہیں رکھا جاسکتا لیکن یہ بہرحال علیحدہ موضوع ہے۔ فیض کی فکشن پر لکھی تحریروں سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گہرے مطالعے کے بعد اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ شرر کے بارے میں کہتے ہیں اور ان کے ہاں سب سے بڑا نقص ایک خاص قسم کی ذہنی کاہلی اور سہل انگاری ہے، شرر ہر چیز کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، فیض نے شرر کے ناولوں کو تین علیحدہ گروپوں میں اقسام کے اعتبار سے تقسیم کر کے جائزہ لیا ہے۔

اقبال پر فیض کے خیالات بھی ان کی منفرد سوچ کے غماز ہیں۔ ان مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کو اقبال کے کلام کے اس پہلو سے زیادہ دلچسپی ہے جس میں جذبے کا بھرپور اظہار ہے۔ لیکن فلسفہ معدوم ہے، فیض اقبال کے کلام میں تنہائی اور سوز و گداز کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں، اس سے ہمیں فیض کے اپنے شعری رویے کا سراغ ملتا ہے لیکن اقبال کے برعکس فیض جوش کے شعری رویے کو زیادہ کڑے تنقیدی معیاروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب بھی گمراہ کن عقیدہ ہے، فیض کے خیال میں خیر و شر کی تمیز کرنے کے لیے درست انقلابی تعلیم کی ضرورت ہے اور اس کے لیے محض جذبہ و جنون کافی نہیں بلکہ فہم و تدبر کی ضرورت ہے، وہ جوش کی شاعری سے مثالیں پیش کر کے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے طبقاتی نظریے کی تنظیم نہیں کی، جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں انقلاب ایک پرہول، دہشتناک اور مہیب سے سانحہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی انقلاب محض ایک تہذیبی واقعہ ہوتا ہے؟ فیض کے ان مضامین کا اسلوب مجلسی اور جمہوری ہے، دوسرے وہ تہذیبی و ثقافتی اداروں کی معرفت معاشرے کی تفہیم اور تعمیرِ نو کے پروگرام کے متلاشی ہیں۔ اکثر مضامین قیام پاکستان سے قبل کی برطانوی ڈپلومیسی کے دائرہ کار میں رہ کر بھی فیض کے مستقبل پر اعتماد کے مظہر ہیں۔ ان مضامین میں فیض فلسفیانہ انداز سے زیادہ دوستانہ انداز سے مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ اور تاریخ کے مادی قوانین سے براہِ راست استفسار کرنے کی بجائے شاعری، ادب کے وسیلے سے حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔
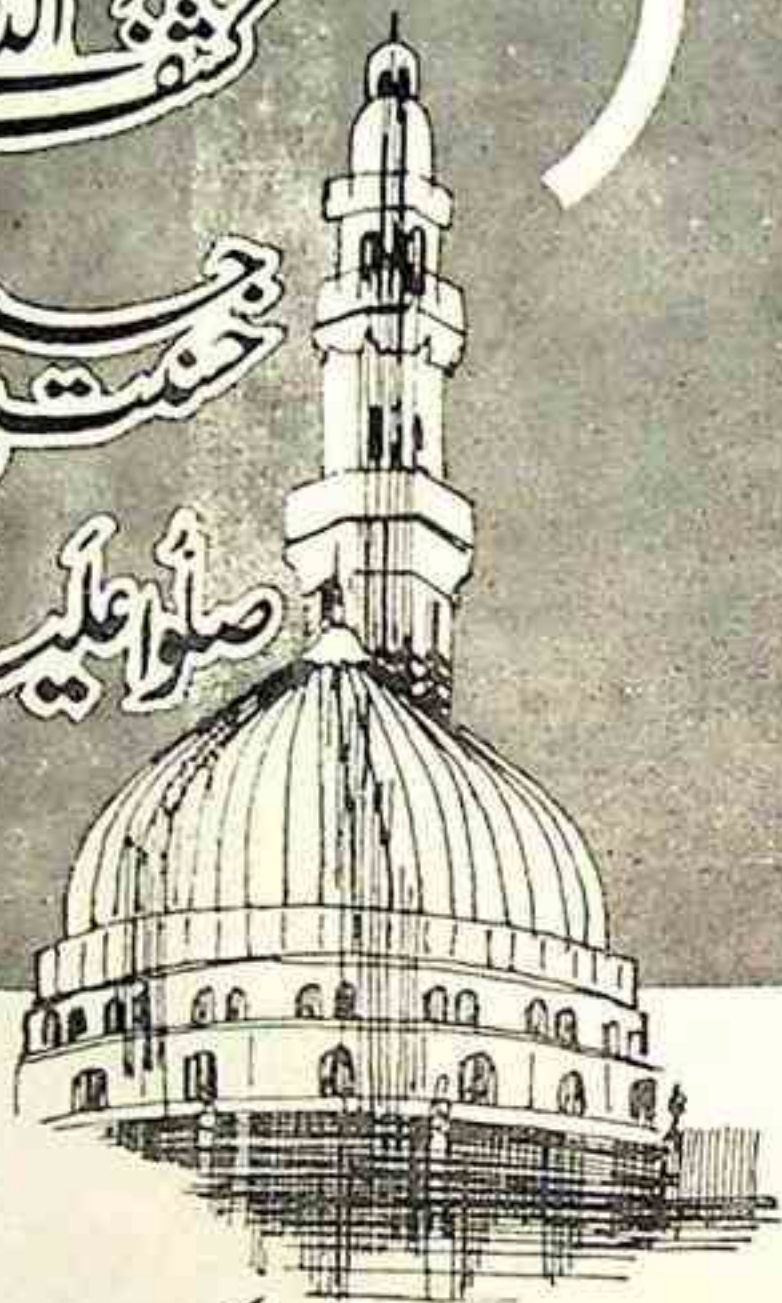
بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
آپ کی خدمت کے لئے کوشاں
manhattan PAKISTAN UBL 82 11

جام شیریں
خالص اجزاء - بہتر شربت
ایک بوتل سے
۳۰ گلاس شربت
جام شیریں
قرشی
تحقیق کی روایت - معیار کی

انتخاب

کلامِ فیض

اِنتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتّوں کا بن

زرد پتّوں کا بن جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کِرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام

بادشاہ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکالے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھالے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہے
ان دُکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں میں سنبھلتے نہیں
دُکھ بتاتے نہیں
مِنتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گُل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھِل کھِل کے
مرجھا گئے ہیں
ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں
بیواؤں کے نام
"کٹڑیوں" اور گلیوں، محلّوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں

کوآکے کرتا ہے اکثر وضو
جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا
آنچلوں کی حنا
چوڑیوں کی کھنک
کاکلوں کی مہک
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو

پڑھنے والوں کے نام
وہ جو اصحابِ طبل و علَم
کے دروں پر کتاب اور قلم
کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے
پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصوم جو بھولپن میں
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لَو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے
اُن اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر

لے کٹڑی کٹڑے کی تصغیر۔ پنجابی میں ملحقہ مکانوں کے احاطے کو کہتے ہیں

جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

(ناتمام)

دُعا

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبّت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خدا یاد نہیں

آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنھیں تابِ گراں باریٔ ایام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منوّر کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سِرِّ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

یومِ آزادی ۱۴ راگست ۱۹۶۷ء

بول........

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسباب غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ درِ و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

انقلاب

مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبُوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے؟

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم واطلس وکمخواب میں بُنوائے ہوئے

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے

پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے؛
اب بھی دلکش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجے!
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

رقیب سے

آ کہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اِس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بُھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گذرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی اِن آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے اِحسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے؟
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے
جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جنکے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لیے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لیے کہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں

اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم

آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بیکار دھکتا ہوا درد

دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پُکار
چند روز اور مری جاں! فقط چند ہی روز

کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بیکار کتے کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ ان کا جہاں بھر کی دھتکار انکی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

○

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے
پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شُعلے لپکنے لگے ھر دیدۂ تر سے
پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ھر اک راہگذر سے
وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے
ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے
پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائیگی سر سے

○

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اے دلِ بیتاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گرانباریٔ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

—

مرے ہمدم، مرے دوست

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست!
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفّاف بلوُر
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کے لیے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے

یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر

مرے گیت ترے دُکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی رُوح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

صبحِ آزادی

اگست ۴۷ء

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حُسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنّا، دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ سحر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دِل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ راہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دِل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

شورشِ بربط و نَے

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
شیرینیٔ لب، خوشبوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیٔ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں اُلجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں، جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل، بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں اگر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکل و لب، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اس دیدۂ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو

پہلی آواز

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہو گا
رعنائیِ شب کا کیا ہو گا، اندازِ سحر کا کیا ہو گا

جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہو گا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہو گا

جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے، نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس کلکِ گہر کا کیا ہو گا

جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اس دردِ جگر کا کیا ہو گا

دوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربطِ و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

سرِ مقتل

(قوالی)

کہاں ہے منزلِ راہ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل، جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اُٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکی محفل میں اس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پندِ بے جا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

ایرانی طلبہ کے نام

جو امن اور آزادی
کی جدوجہد میں کام آئے

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لُٹ
جن کے جسموں
بھرپُور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم

ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
اِن ہاتوں کی بے کل چاندی
کِس کام آئی ، کس ہاتھ لگی ؟ "

" اے پوچھنے والے پردیسی
یہ طفل و جواں
اُس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچّی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من ، تن تن ،
ان چہروں کے نیلم ، مرجاں ،
جگ مگ جگ مگ ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن ! "

نثار میں تیری گلیوں کے...

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم وجاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظمِ بست وکشاد
کہ سنگ[۱] وخشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے
جو چند اہل جُنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدّعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح وشام کرتے ہیں

---

[۱] سنگ ہا رابستند وسگاں راکشادند (شیخ سعدی)

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی

غرض تصوّرِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اِسی سبب سے فلک کا گِلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں

گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

مُلاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نورُ، رو گئے ہیں
یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے

گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رُونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نُورگر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ، سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منھ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُونچی رکھیں لَو

لاہور جیل - ۲۸ مارچ - منٹگمری جیل - ۱۵ اپریل ۵۴ء

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے
خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عُشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل ۱۵ مئی ۵۴ء

AFRICA COME BACK

ایک رجز

آجاؤ، میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال
"آجاؤ ایفریقا"
آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
"آجاؤ ایفریقا"

افریقی حریت پسندوں کا نعرہ

پنجے ہیں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
"آجاؤ ایفریقا"
جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
"آجاؤ ایفریقا"
دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا"
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"
آؤ ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"

منٹگمری جیل ۱۴، جنوری ۵۵ء

بنیاد کچھ تو ہو

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیّاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلّاد کچھ تو ہو
جب خونبہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالۂ ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منٹگمری جیل ۱۳ اپریل ۵۵ء

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے

ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے

اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے

ہاں جام اٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے

اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبح گلستاں ہے ترا رُوئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے
ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنّا ترے قدموں کی صدا ہے
تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے
زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے
"مجبوری و دعوئے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

○

بے دم ہُوے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صِلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شبگیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل - جنوری ۱۹۵۹ء

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل - ۱۱ فروری ۱۹۵۹ء

○

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

قلعہ لاہور — مارچ ۱۹۵۹ء

لہو کا سُراغ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیِ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خونبہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا، بے آسرا، یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدّعی، نہ شہادت، حساب پاک ہُوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہُوا

کراچی جنوری ۱۹۶۵ء

غم نہ کر، غم نہ کر

درد تھم جائے گا غم نہ کر، غم نہ کر
یار لوٹ آئیں گے، دل ٹھہر جائے گا، غم نہ کر، غم کر
زخم بھر جائے گا،
غم نہ کر، غم نہ کر
دن نکل آئے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
ابر کھل جائے گا، رات ڈھل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر
رُت بدل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر

جون ۱۹۶۵ء

سرِ وادیِ سینا

(عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفّا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

دلدار دیکھنا

طوفاں بہ دل ہے ہر کوئی دلدار دیکھنا
گُل ہو نہ جائے مشعلِ رخسار دیکھنا
آتش بہ جاں ہے ہر کوئی سرکار دیکھنا
لَو دے اُٹھے نہ طرۂ طرّار دیکھنا
جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا، نہ سنگ، نہ دیوار دیکھنا
کُوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آگئے تو گرمیٔ بازار دیکھنا
اُس دل نواز شہر کے اطوار دیکھنا
بے التفات بولنا، بیزار دیکھنا
خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رُعبِ قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا
جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا
جس سمت دیکھنا، گُل و گلزار دیکھنا
پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر اِدھر اک بار دیکھنا

۱۹۶۷ء

حذر کرو مرے تن سے

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا
مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
نہ اس سے آگ ہی بھڑکے نہ اس سے پیاس بجھے
مرے فگار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
مگر وہ زہر ہلاہل بھرا ہے نس نس میں
جسے بھی چھیدو ہر اک بوند قہرِ افعی ہے
ہر اک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مُہر بلب غیظ و غم کی گرمی ہے
حذر کرو مرے تن سے یہ سَم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے

بجائے سرو و سمن میری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

مارچ ۷۱ء

سجّاد ظہیر کے نام

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غمہائے وطن پر اشکباری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں،
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلّم
سحر اور اس کا آغازِ تبسّم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحر گہ اب اُسی کے نام ساقی
کریں اتمامِ دورِ جام ساقی
بساطِ بادہ و مینا اُٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

دہلی ستمبر ۱۹۷۳ء

اے شام مہرباں ہو!

اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہر یاراں
ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی دوپہر ستم کی
بے سبب ستم کی
دوپہر درد و غیظ و غم کی
بے زباں درد و غیظ و غم کی
اس دوزخی دوپہر کے تازیانے
آج تن پر دھنک کی صورت
قوس در قوس بٹ گئے ہیں
زخم سب کھل گئے ہیں
داغ جانا تھا چھٹ گئے ہیں
ترے توشے میں کچھ تو ہوگا
مرہم درد کا دوشالہ

تن کے اس انگ پر اڑھا دے
درد سب سے سوا جہاں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہر یاراں
ہم پہ مہرباں ہو

دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے
کرچیاں دیدۂ حسد کی
خس و خاشاک رنجشوں کے
اتنی سنسان شاہراہیں
اتنی گنجان قتل گاہیں
جن سے آئے ہیں ہم گزر کر
آبلہ بن کے ہر قدم پر
یوں پاؤں کٹ گئے ہیں
رستے سمٹ گئے ہیں
مخملیں اپنے بادلوں کی
آج پاؤں تلے بچھا دے
شافیِ کربِ رہرواں ہو
اے شام مہرباں ہو

اے مہِ شب نگاراں
اے رفیقِ دلفگاراں
اس شام ہمزباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام شہریاراں
ہم پہ مہرباں ہو

۱۹۷۴ء

ڈھاکہ سے واپسی پر

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

۱۹۷۴ء

تم اپنی کرنی کر گزرو

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے
یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے

سو بار کٹے اور بھر پایا

اب کیوں اس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے درگزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
یاد میں رونے والے کا
اپنے فرض سے فارغ ہو کر
اپنے لہو کی تان کے چادر
سارے بیٹے خواب میں ہیں
اپنے غموں کا ہار پرو کر
اماں اکیلی جاگ رہی ہے

لینن گراڈ ۱۹۷۶ء

ربّا سچّیا

ربّا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں
ساڈا نیب تے عالی جاہ ہیں توں
ایس لارے تے ٹور کدی پچھیا ای
کیہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار دی لئی اُو رب سائیاں
تیرے نال جگ کیہ کیتیاں نیں
کتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈاں چ کلپے جان میری
جیویں پھاہی چ کونج کُرلاوندی اے

چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں
مینوں "تاہنگ" نئیں، محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیوین دی ٹکر منگناں ہاں
میری منّتیں تے تیریاں میں منّاں
تیری سَونہہ جے اک وی گل موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پُجدی تیں ربّا
فیر میں جاواں تے رب کوئی ہور لوڑاں

۱۹۷۴ء

دلِ من مسافرِ من

مرے دل، مرے مسافر
ہُوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
تمھیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا!

لندن ۱۹۷۸ء

شاعر لوگ

ہر اک دَور میں ہم، ہر زمانے میں ہم
زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے
جان دیتے رہے زندگی کے لیے
ساعتِ وصل کی سرخوشی کے لیے
دین و دنیا کی دولت لٹاتے رہے
فقر و فاقہ کا توشہ سنبھالے ہوئے
جو بھی رستہ چنا اس پہ چلتے رہے
مال والے حقارت سے تکتے رہے
طعن کرتے رہے، ہاتھ ملتے رہے
ہم نے اُن پر کیا حرفِ حق سنگ زن
جن کی ہیبت سے دنیا لرزتی رہی
جن پہ آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا

اپنی آنکھ اُن کے غم میں برستی رہی
سب سے اوجھل ہوئے حکمِ حاکم پہ ہم
قید خانے سہے، تازیانے سہے
لوگ سنتے رہے سازِ دل کی صدا
اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے
خونچکاں دہر کا خونچکاں آئینہ
دُکھ بھری خلق کا دُکھ بھرا دل ہیں ہم
طبعِ شاعر ہے جنگاہِ عدل و ستم
منصفِ خیر و شر، حق و باطل ہیں ہم

لاؤ تو قتل نامہ مرا

سننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی

رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی

آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی

"لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

ندائے غیب

ہر اک اُولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے!
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

سمرقند - مئی ۷۹ء

ہم تو مجبورِ وفا ہیں

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہو گا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

تیرے ایوانوں میں پُرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شہ راہوں میں سنگسار ہوئے

بلاکشانِ محبت پہ جو ہُوا سو ہُوا
جو مجھ پہ گزری مت اس سے کہو ہُوا سو ہُوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھوئیے ہُوا سو ہُوا

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

کیا کریں

مری تری نگاہ میں

جو لاکھ انتظار ہیں

جو میرے تیرے تن بدن میں

لاکھ دل فگار ہیں

جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے

سب قلم نزار ہیں

جو میرے تیرے شہر کی

ہر اک گلی میں

میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشاں مزار ہیں

جو میری تیری رات کے

ستارے زخم زخم ہیں

جو میری تیری صبح کے

گلاب چاک چاک ہیں

یہ زخم سارے بے دوا

یہ چاک سارے بے رفو

کسی پہ راکھ چاند کی

کسی پہ اوس کا لہو

یہ ہے بھی یا نہیں، بتا

یہ ہے کہ محض جال ہے

مرے تمہارے عنکبوتِ وہم کا بُنا ہوا

جو ہے تو اس کا کیا کریں

نہیں ہے تو بھی کیا کریں

بتا، بتا

بتا، بتا

بیروت ۱۹۸۰

فلسطینی بچے کیلیے لوری

مت رو بچّے
رو رو کے ابھی
تیری امّی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچّے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابّا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچّے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دُور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچّے

تیری باجی کا
ڈولا پرائے دیس گیا ہے
مت رو بچے
تیرے آنگن میں
مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندرماء دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچے
امّی، ابا، باجی، بھائی
چاند اور سورج
تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے اِک دن بھیس بدل کر
اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے

بیروت ۸۰ء

فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تیری الفت، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی
تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی
سارے اَن دیکھے رفیقوں کا جلو ساتھ رہا
کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا
دور دیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں
جس زمیں پر بھی کھُلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطین کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد!
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

بیروت - ۸۰ء

○

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صید تھے اب صیاد ہوئے

پہلے بھی خزاں میں باغ اُجڑے پر یُوں نہیں جیسے اب کے برس
سارے بُوٹے پتہ پتہ روش روش برباد ہوئے

پہلے بھی طوافِ شمعِ وفا تھی، رسمِ محبّت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصُور ہوئے، فرہاد ہُوئے

اِک گُل کے مرجھانے پر کیا گلشن میں کہرام مچا
اِک چہرہ کمھلا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے

فیضؔ، نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہُوئے *

---

* غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

○

وہ بُتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی وہ وقارِ دستِ دعا گیا

نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا، نہ روش وہ ابرِ بہار کی
جس ادا سے یار تھے آشنا وہ مزاجِ بادِ صبا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا تو وہ آبروئے وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدّعی تو ثوابِ صدق و صفا گیا

ابھی بادبان کو تہ رکھو ابھی مضطرب ہے رُخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آکے چلا گیا

تم ہی کہو کیا کرنا ہے

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے
جیون کی ناؤ ڈالی تھی
تھا کتنا کس بل بانہوں میں
لوہو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگی
ایسا نہ ہوا، ہر دھارے میں
کچھ اَن دیکھی منجدھاریں تھیں
کچھ مانجھی تھے انجان بہت
کچھ بے پرکھی پتواریں تھیں
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
ندیا تو وہی ہے ناؤ وہی

اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
اب کیسے پار اترنا ہے
جب اپنی چھاتی میں ہم نے
اس دیس کے گھاؤ دیکھے تھے
تھا دیدوں پر دشواس بہت
اور یاد بہت سے نسخے تھے
یوں لگتا تھا بس کچھ دن میں
ساری بپتا کٹ جائے گی
اور سب گھاؤ بھر جائیں گے
ایسا نہ ہوا کہ روگ اپنے
کچھ اتنے ڈھیر پرانے تھے
دیدان کی ٹوہ کو پا نہ سکے
اور ٹوٹکے سب بیکار گئے
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے

لندن سنہ ۸۱ء

○

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنّف کا قلم ہے

آوارہ ہے پھر کوہِ ندا پر جو بشارت
تمہیدِ مسرّت ہے کہ طولِ شبِ غم ہے

جس دھجّی کو گلیوں میں لیے پھرتے ہیں طفلاں
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علَم ہے

جس نور سے ہے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زرخانۂ جم ہے

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آکر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

۱۹۷۶ء

عشق

○

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

خدا وہ وقت نہ لائے ......

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینہ دل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حسن سراپا نیاز ہو تیرا
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

میں دلفگار نہیں، تو ستم شعار نہیں
بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں

ترا ہی عکس ہے اُن اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو!
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی، قندیل روشن ہے
ترے جلووں سے بزمِ زندگی جنت بداماں ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک "تارِ نفس" میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی
مگر جانِ حزیں صدمے سہیگی آخرش کب تک؛
تری بے مہریوں پہ جان دیگی آخرش کب تک؟

تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
مرے دل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دھندلائی ہوئی آنکھیں
تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی
پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذت نہ پائینگے
گلو میں تیری اُلفت کے ترانے سوکھ جائینگے

مبادا یاد ہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موجہائے تم میں کھو جائیں
مرے دل کی تہوں سے تیری صورت دُھل کے بہ جائے
حریمِ عشق کی شمعِ درخشاں بجُھ کے رہ جائے
مبادا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو!

غزل

چشمِ میگوں ذرا اِدھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

تیز ہے آج دردِ دل ساقی
تلخیٔ مے کو تیز تر کر دے

جوشِ وحشت ہے تشنہ کام بھی
چاکِ دامن کو تا جگر کر دے

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

لُٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز
کاش وہ اِس طرف نظر کر دے

فیضؔ تکمیلِ آرزو معلوم!
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

O

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت وایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

○

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُبھرنے لگتے ہیں

○

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو، اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام
دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی کا نام
اِن دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
محتسب کی خیر، اُونچا ہے اُسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا پیمانے کا نام
ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام
فیضؔ اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

○

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

بامِ مینا سے ماہتاب اُترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے

ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

عمر کے ہر ورق پہ دل کی نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے

جل اُٹھے بزمِ غیر کے در و بام
جب بھی ہم خانماں خراب آئے

اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے

فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

○

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کُنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذرخواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

شاید قریب پہنچی صُبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں، سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرِ باراں

آئے گی فیضؔ اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

○

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو، فیض، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

○

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب تیرا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جولائی ۵۳ء جناح ہسپتال کراچی

○

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کُنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے
مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

○

تمہارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمہاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

حیدرآباد جیل ۔ ۱۹۵۱ء

○

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشاق کی خبر لینا !
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

○

دیوارِ شب اور عکسِ رخِ یار سامنے
پھر دل کے آئینے سے لہو پھوٹنے لگا
پھر وضعِ احتیاط سے دھندلا گئی نظر
پھر ضبطِ آرزو سے بدن ٹوٹنے لگا

سنہ ۱۹۶۶ء

○

تری امید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہمکلام کب سے ہے

لاہور۔ مارچ ۱۹۶۵ء

○

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

○

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

کب مہکے گی فصلِ گل کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہوگی کب شامِ نظر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معیّن ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

○

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

سایۂ چشم میں حیراں رُخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نے رنگ پہ تھے اپنے لہو کے دم سے
دل نے لَے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ

اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

کراچی ۱۹۶۵ء

مرثیہ

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

بیتا دید اُمید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیضؔ دلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی لُٹ جانا بھی
تم اُس حسن کے لطف وکرم پر کتنے دن اِتراؤ گے

اکتوبر ۱۹۶۸ء

○

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے

رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

تیرے قول و قرار سے پہلے
اپنے کچھ اور بھی سہارے تھے

جب وہ لعل و گہر حساب کیے
جو ترے غم نے دل پہ وارے تھے

میرے دامن میں آ گرے سارے
جتنے طشتِ فلک میں تارے تھے

عمرِ جاوید کی دعا کرتے
فیضؔ اتنے وہ کب ہمارے تھے

۱۹۷۲ء

○

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیازمندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ستم پہ خوش، کبھی لطف و کرم سے رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا

۱۹۷۴ء

بہار آئی

بہار آئی تو جیسے یکبار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جیے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مُشکبو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں
اُبل پڑے ہیں عذاب سارے
ملالِ احوالِ دوستاں بھی
خمارِ آغوشِ مہ وشاں بھی
غبارِ خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے
سوال سارے جواب سارے
بہار آئی تو کھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے

اپریل ۱۹۷۵ء

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

غمِ جہاں ہو، رُخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا

خوشا کہ آج ہر اک مدعی کے لب پہ ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

وہ حیلہ گر جو وفا جُو بھی ہے جفا خُو بھی
کیا بھی فیضؔ تو کس بُت سے دوستانہ کیا

۱۹۷۶ء

○

کس شہر نہ شہرہ ہوا نادانیٔ دل کا
کس پر نہ کھلا راز پریشانیٔ دل کا

آؤ کریں محفل پہ زرِ زخم نمایاں
چرچا ہے بہت بے سروسامانیٔ دل کا

دیکھ آئیں چلو کوئے نگاراں کا خرابہ
شاید کوئی محرم ملے ویرانیٔ دل کا

پوچھو تو ادھر تیر فگن کون ہے یارو
سونپا تھا جسے کام نگہبانیٔ دل کا

دیکھو تو کدھر آج رُخِ بادِ صبا ہے
کس رہ سے پیام آیا ہے زندانیٔ دل کا

اترے تھے کبھی فیضؔ وہ آئینۂ دل میں
عالم ہے وہی آج بھی حیرانیٔ دل کا

گیت

منزلیں، منزلیں،
شوقِ دیدار کی منزلیں،
حُسنِ دلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں،
پیار کی بے پناہ رات کی منزلیں،
کہکشاؤں کی بارات کی منزلیں،
سربلندی کی، ہمت کی، پرواز کی،
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں
زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں
سربلندی کی، ہمت کی، پرواز کی منزلیں
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں،
آن ملنے کے دن

پھول کھلنے کے دن
وقت کے گھور ساگر میں صبح کی
شام کی منزلیں،
چاہ کی منزلیں
آس کی، پیاس کی،
حسرتِ یار کی
پیار کی منزلیں،
منزلیں حُسنِ عالم کے گلزار کی
منزلیں، منزلیں
موج در موج ڈھلتی ہوئی رات کے درد کی منزلیں
چاند تاروں کے ویران سنسار کی منزلیں،
اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں
حق کے عرفان کی
نورِ انوار کی منزلیں،
وصلِ دلدار کی منزلیں
قول واقرار کی منزلیں،
منزلیں، منزلیں

دو غزلیں

مخدوم کی یاد میں

"آپ کی یاد آتی رہی رات بھر"
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

گاہ جلتی ہوئی، گاہ بجھتی ہوئی
شمعِ غم جھلملاتی رہی رات بھر

کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

پھر صبا سایۂ شاخِ گُل کے تلے
کوئی قصہ سناتی رہی رات بھر

جو نہ آیا اُسے کوئی زنجیرِ در
ہر صدا پر بلاتی رہی رات بھر

ایک اُمّید سے دل بہلتا رہا
اک تمنّا ستاتی رہی رات بھر

ماسکو
ستمبر ۷۸ء

○

"اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھُلا آخر شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخر شب
صبح پھُوٹی تو وہ پہلو سے اُٹھا آخر شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب

ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

آج پھر درد و غم کے دھاگے ہیں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھول

ترکِ اُلفت کے دشت سے چُن کر
آشنائی کے ماہ و صال کے پھول

تیری دہلیز پہ سجا آئے
پھر تیری یاد پر چڑھا آئے

باندھ کر آرزو کے پلّے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

○

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دِوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

منزل کو نہ پہچانے رہِ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا

تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

واعظ سے رہ و رسم رہی رند سے صحبت
فرق ان میں کوئی اتنا زیادہ تو نہیں تھا

لاہور۔ فروری ۸۳ء

اِدھر نہ دیکھو

ادھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمّت کے مُدّعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں صدق ایماں کی
آزمودہ پرانی تلوار مُڑ گئی ہے
جو کج کُلہ صاحب حشم تھے
جو اہلِ دستار محترم تھے
ہوس کے پُر پیچ راستوں میں
کُلہ کسی نے گِرو رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے
ادھر بھی دیکھو
جو اپنے رخشاں لہو کے دینار

مفت بازار میں لُٹا کر
نظر سے اوجھل ہوئے
اور اپنی لحد میں اس وقت تک غنی ہیں،
ادھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے رخصت ہوئے
اور اہلِ جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں

⁂ ——— ⁂ ——— ⁂

تنہائی

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چارسو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزُو، خواب، تیرا روئے حسیں!

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے اور کل کی خبر کسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم؟

زندگی، ہیچ! لیکن آج کی رات؟
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات؟

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

اب نہ دُہرا فسانہائے الم اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اُتار دے دل سے عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو

عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکائتیں مت پوچھ

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

ایک منظر

بام دور خامشی کے بوجھ سے چور　　آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور　　شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خوابگاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں!

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں، کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے!

مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل

خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم

نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل

سبز گوشوں میں نیلگوں سائے

لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں

موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل

ظلم کا زہر گھولنے والے

کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں

وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

یاد

وشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
وشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور افق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

شام

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اجڑا ہوا ، بے نور پرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام ، ہر اک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے ، ماتھے پر سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے

جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوستہ ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہوگا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے ، وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی ، کوئی پایل بولے
کوئی بت جاگے ، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر اک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہِ شبِ غم نظر پہ کھلتا نہیں اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

پاس رہو

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیے، نشترِ الماس لیے
بَین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں
آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قُلقُلِ مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو!

ماسکو ۱۹۶۳ء

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا، "آہستہ"
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

ماسکو ۔ ۱۹۶۳ء

یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جالگی ہے افق کنارے
اُداس رنگوں کی چاندنیا
اتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھویا
تمام تارے
اکھڑ گئی سانس پتیوں کی
چلی گئیں اُونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکمِ خامشی کا
تو چپ میں گُم ہوگئیں صدائیں
سحر کی گوری کی چھاتیوں سے

ڈھلک گئی تیرگی کی چادر
اور اس بجائے
بکھر گئے اس کے تن بدن پر
نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رُخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغِ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے
یہ وقت آئے تو بے ارادہ
کبھی کبھی میں بھی دیکھتا ہوں
اتار کر ذات کا لبادہ
کہیں سیاہی ملامتوں کی
کہیں یہ گُل بُوٹے اُلفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی

کہیں یہ خونِ جگر کے دھبّے
یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا
یہ مُہر ہے یارِ مہرباں کی
یہ لعل لب ہائے مہوشاں کے
یہ مرحمت شیخِ بدزباں کی

یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
عزیز بھی، ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ الفت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لو

تاشقند ۱۹۷۹ء

آج شب کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دُور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلّات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے،
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
"کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صُورت"
کوئی امّید، کوئی آس مسافر صُورت
کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
تم اگر ہو، تو مرے پاس ہو یا دُور ہو تم
ہر گھڑی سایہ گرِ خاطرِ رنجور رہو تم
اور نہیں ہو تو کہیں — کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے،

مرثیے

(۱)

دُور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اتنے
اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہُوئے کتنے

(۲)

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

دولتِ لب سے پھر اے خسروِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

گرمیٔ رشک سے ہر انجمنِ گُل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا

صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا

دیدہ و دل کو سنبھالو کہ سرِ شامِ فراق
ساز و سامان بہم پہنچا ہے رسوائی کا

(۳)

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

بیتا دید امید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیضؔ دلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی لٹ جانا بھی
تم اس حسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اتراؤ گے

○

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار ہے کون

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون

پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانیے پھر دلِ وحشی کا طلب گار ہے کون

جولائی ۵۳ء جناح ہسپتال کراچی

فیض احمد فیض